

تہذیب و ادب

# تین غنڈے

افسانے

کرشن چیمپز



**PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani**

**Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081**



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنز»  
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

یقین غنڈے

کرشن چندر

تین غنڈے

نیا ادارہ

جملہ حقوق محفوظ

بار سوم ۱۹۶۴

برائے تمام: نغیر احمد چودھری  
حکایت اسلام بکس میں چھپی

## ترتیب

۹ ، پال

۲۹ ، خلیج

۵۷ ، ایک اسٹراٹوکی

۸۱ ، پھانسی کے سائے

۹۹ ، بحر

۱۱۷ ، یقین غنڈے

# چال

”چال!“

”یہ ڈارنگ!“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں تمہاری ڈارنگ نہیں ہوں۔“

”تم ہو۔ میں نے جب کہہ دیا۔ بس۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا۔“

”میں یہ پہلے بھی سن چکی ہوں۔“

”میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کتنی بار۔ پر اس میں۔“

”بڑے سٹور ہو تم۔“

”نہیں۔ میں سٹور نہیں ہوں۔ میں آریں ہوں۔ تم بھی آریں ہو۔ ہم

دونوں آریں نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں فرانسیسی ہوں تم انگریز ہو۔ یہ  
ہندوستان ہے، اور ہم دونوں آریں نسل کے افراد اس جنگل میں، اس صحرا  
میں، اس ویرانے میں، اس سمندر میں لکیلے ہیں۔ ایک جزیرے کی طرح۔  
بتاؤ ہم کیوں محبت نہ کریں ڈور تھی..... ڈور تھی تمہارا نام عجیب سا ہے  
ڈور تھی، مجھے پسند نہیں ہے تمہارا نام ہونا چاہیے تھا۔ لی زل، از ایلا، روزا  
وانا، ہاں بس وائنا ٹھیک رہے۔ پیارا نام ہے، شرابی نام ہے۔ مغربی  
فرانس کی بیلوں کی طرح لطافت ہے اس میں۔ وہ کیف، وہ بہار، وہ  
رہنائی..... وائنا.....!

”بڑی عجیب باتیں کرتے ہو تم، بڑی پیاری باتیں.....“  
”تمہیں پسند ہیں نایہ باتیں۔ سبھی عورتیں مجھ سے یہی کہتی ہیں۔“  
”سبھی عورتیں؟..... تو کیا تم..... ہٹو، مجھے جانے دو۔ میں  
تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی۔“

”نہیں بیٹو، انگریزی قوم بھی سچ مچ کس قدر عجیب ہے۔ محبت  
کے نام سے بدلتی ہے، محبت فرانسیسی کلچر کی جان ہے، اب اگر تمہاری  
جگہ کوئی فرانسیسی میڈمزیل ہوتی۔ تو جانتی ہو کیا کہتی..... اچھا جانے دو بیٹو



یہ ہندوستان ہے اور ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور آج کی رات ہماری ہے۔  
 ”آج کی رات؟ احمق، تم مجھے گھر پر پہنچا کے آؤ گے نا۔ پاپا انتظار  
 کر رہے ہوں گے۔“

”شش..... پاپا کا نام نہ لو۔ آج کی رات ہماری ہے۔ یہ چینی  
 رستوران ہے۔ چینی کھانا ہندوستان میں، اور ہندوستانی کھانا چین میں  
 میں جب چنگ کنگ تھا۔ تو ایک ہندوستانی رستوران میں کھانا کھانے  
 جایا کرتا تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔ انڈیا کافے... انڈیا کافے... ہائے  
 فرانسیسی کافے یاد آتے ہیں ہر روز۔ بار بار۔ ہر لمحے یاد آتے ہیں۔ یہ بھی  
 کوئی کافے ہیں نہ وہ نفاست ہے۔ نہ وہ ناز کی نہ وہ گفتار کا لہجہ۔ اپنی پیاری  
 میٹھی زبان کو سننے کے لئے ترستا ہوں معاف کرنا تمہاری انگریزی اس  
 طرح بولی جاتی ہے۔ جس طرح پتھر ٹی سڑک پر رولر چل رہا ہو۔“  
 ”شٹ اپ“

”سچ کہتا ہوں اور سچ کو بھڑٹا شٹ اپ کہا جاتا ہے، ڈور تختی مجھے  
 تم سے عشق ہے۔ مجھے فرانس سے عشق ہے۔ لیکن آج ہم دونوں اکیلے  
 ہیں۔ بیرہ ابر کھانا یہاں نیچے رکھ دو۔ نہیں اس میز پر نہ رکھو، کھانا پھر

کھائیں گے۔ غٹوڑی دہر کے بعد ہی ٹیکن عبت نہیں رک سکتی۔ کل لے کے لئے نہیں۔ گجراتی کہوں ہو۔ یہ بیرو اتنی انگریزی نہیں سمجھتا؟  
"فرض کرو کہ یہ سمجھتا ہے تو؟"

"تو بھی کیا پروا ہے ہر روز اس ٹبل پر اسی قسم کی گفتگو سنتا ہے غالباً....."

"تم تو نرے غنڈے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں رستوران میں چلی آئی؟"

"تم یہ بات دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ یہ جھوٹ ہے مگر ہے۔ دفتر دھکا ہے میں اُسے خوب پہچانتا ہوں۔ سنو وہ سچی میں تمہیں دانا کوئی نہیں کوئی اعتراض ہے تمہاری آنکھیں کسے دیتی ہیں تمہیں کوئی اعتراض نہیں کرتی تو کہیں کروں کا نام ہوتا ہے نا۔ سنو دانا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ اس سے پہلے بھی تمہیں کئی انگریز مردوں نے یہ بتایا ہوگا۔ پر آج ایک فرانسیسی کی زبان سے سن لو تمہارا حسن بالکل نیا ہے۔ اس میں کنوارپتے کی ٹانگی ہے۔ مجھے تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بالکل منزل اور ان شہ آف تہیوں کی گہرائیاں، اور یہ داربارنگت، جیسے زمروں میں شہد ظہور اور سے بال، ٹانڈ۔ صحرائی ریت کی

طرح تابناک، آہٹا۔ کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے ان میں سے ....  
 ”ہٹو۔ مجھے نہ چھوؤ۔“

”کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے ان میں سے۔ اچھی۔ پیاری۔ ہلکی نیکیں جیسے  
 بحرِ شمالی کی ہواؤں کی تازگی اور خنکی ان میں رچی ہوئی ہے۔ آہ۔۔۔۔۔  
 بڑے انگریز عورت۔ تو نے کبھی کسی فرانسیسی سے محبت کی ہے۔ نہیں؟ تو  
 تو نے زندگی میں محبت کی معراج کھودی ہے۔ مجھے عشق کر۔“  
 ”سچ مچ بڑے باتونی ہو۔ شاید اسی لیے مجھے کچھ پسند ہو۔“  
 ”ہاں۔ اب آئیں راہِ راست پر۔ ہر عورت پہلے بٹھک جاتی ہے  
 پھر راہِ راست پر آجاتی ہے کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔“  
 ”تمہارا تجربہ؟“ اُف۔ کس قدر بے حیا ہو تم۔“

”سچی بات کہتا ہوں۔ اُس ملک کا بیٹا ہوں جس نے انقلاب کی  
 پہلی موج کو جنم دیا۔ سچی بات کہتا ہوں وائسا، تم مجھے پسند کرتی ہو میں  
 تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اور ہم دونوں اکیلے ہیں اور یہ ہندوستان ہے اور  
 آج جنگ ہے۔ اور موت کا طبل بج رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میں کل مر  
 جاؤں، تم پونا سے تبدیل ہو کر اسکندریہ یا مدینہ یا کوئی اسی قسم

کا ذلیل مقام، پھر آج یہ جو اتفاق سے ہم تم دونوں اکٹھے ہوئے ہیں۔  
 پھر کب مل سکیں گے۔ میں اسے مجبورہ نہیں کہتا۔ اتفاق کہتا ہوں لاکھوں  
 لاکھوں لاکھوں لاکھوں گردشوں کے درمیان دو ذرے ٹکرائے ہیں اور تم  
 ..... آؤ اس لمحے کو مکمل کر لیں ہیں پونا ہوٹل میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک  
 کمرہ ہے۔ اور چاروں طرف خاموشی ہے۔ زندگی سو رہی ہے۔ کھڑکی میں  
 گلاب کی سیلیں ہیں۔ دو بڑے بڑے پھول، دو پاکیزہ آنسوؤں کی طرح  
 تمہارے بالوں میں جگمگاتے نظر آئیں گے۔ آہ ڈار لنگ!“

”بھٹی مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے“

”تو آؤ کھانا کھائیں۔ مادی باتوں کا ذکر کر دو گی۔ انگریز عورت  
 جو ٹھیکریں فرانسیسی ہمیشہ محبت کو ترجیح دیتا ہے، انگریز کھانے کو معائن  
 کرنا ڈار لنگ یہ مادیت تمہارے سمراج کی بنیاد ہے۔ جس میں ہندوستان بھی  
 شامل ہے۔ کہو اس ملک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“

”میں نے دیکھا ہی نہیں اسے ابھی تک، مگر اتنا ضرور جانتی ہوں

کہ — کہ اس میں بدبو بہت ہے۔“

”بدبو؟ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ ملک بدبوؤں سے بھرا ہوا ہے

اور ہم تم دونوں اکیلے ہیں۔ دو پاک و صاف سفید آریں نسل کے فرد۔ آؤ  
بھول جائیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ہجے... ہجے...  
”کوئی دیکھ لے گا۔ کوئی سن لے گا۔“

”ہجے... ہجے...“

”... روٹی...“

”گٹ آؤٹ بیرہ...“

”پال“

”ہاں پیارے“

”سان سے طو۔ یہ آخر ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شاعر، یہ جادو  
ہیں ہندوستان کے بہت بڑے ایکٹر۔ یہ دیاس ہیں۔ ہندوستان کے بہت  
بڑے کوی، یہ اننت ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شکاری!“  
”اور اس کمرے میں لڑکی ایک بھی نہیں۔ تم لوگ۔ ہندوستان کے  
بڑے لوگ عورت کے بغیر زندگی کس طرح بسر کرتے ہو؟“

”ہم میں سے کوئی شخص بھی عورت کے بغیر زندگی بسر نہیں کرتا۔ ہم لوگ

بیوی بچوں والے ہیں۔ ماں بہنوں والے ہیں، عشق بھی کرتے ہیں، اشتاں بھی رکھتے ہیں۔“

”مگر پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ معاف کرنا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر ہندوستانی نے اپنی عورت کو خواہ گاہ کی چار دیواری میں قید کر رکھا ہے، مجھے گھٹن سی محسوس ہوتی ہے یہاں، اک عجیب سی کلی بھلا میں مجھے ہر طرف پرے اور دیواریں نظر آتی ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ اچھا کیا بتاؤں کیا جی چاہتا ہے۔ سُن کر کیا کر دے گا۔ میں پر دیسی ہوں تم ہندوستانی ہو۔ میں گورا ہوں تم کالے ہو۔ مجھے نفرت کہتے ہو گے اپنے دل میں۔ ہر دیواری سے تمہیں نفرت ہوگی۔ میری باتوں پر تمہیں کیونکر اعتبار آئے گا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے پال۔ ہمیں کسی فرد سے نفرت نہیں۔ ہم تو اسی نظامِ زندگی سے نفرت کرتے ہیں، جو ہمارے اور تمہارے درمیان نفرت کا بیج بوتا ہے۔“

”کتابی باتیں نہ کہو زندگی کی زبان میں بات کرو۔ معاف کرنا۔ یہ لوگ یہ فریچر، تمہاری روحانی غربت اور ذہنی افلاس کا آئینہ دار ہے۔ کیا اس طرح رہتے ہیں۔ مذہب لوگ۔ یہ بھدے پھول میوں کی درمی۔ یہ بڑا

آئینہ، یہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی، یہ صوفے جو اب نذر پڑی ہیں۔  
ذائشیائی، یہ کونسی تہذیب ہے۔ کونسا کلچر ہے، کس سترت کی  
آئینہ داری کرتی ہے۔ ذرا بتا دو۔ ہم تم اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس  
کمرے کی شخصیت کیا ہے؟

”شش۔ سنبھل کربات کرو۔ ہوش میں آؤ پال۔ یہ کمرہ اختر کی محبوبہ

کا ہے۔“

”اختر کی محبوبہ کا ہے؟ ہائے غریبی۔ معاف کرنا شاعر تم شاعر ہو۔  
تمہارا دل شاعر کا ہو گا لیکن اس کمرے کی روح اس قدر غریب کیوں ہے،  
یہ ویران دیواریں، یہ لنگے آئینے، یہ بے ڈول صوفے.....“

”کرا یہ پراٹھا لایا ہوں.....“

”محبت کراٹے سے نہیں خریدی جاتی، یہ محبت نہیں ہے جیوا  
ہے، جانتے ہو اگر یہ کمرہ میری محبوبہ کا ہوتا تو میں کیا کرتا۔ میں اس کمرے کی  
ہر دیوار کو جنسیل کسے پھولوں سے ڈھانپ دیتا جنسیل کے تازک پھول جیسے  
فرانس کی کنواری..... یا سمن..... تمہارے ملک میں یا سمن کی اس قدر  
ہستات ہے۔ اور پھر بھی یہ دیواریں ننگی ہیں۔ یہ آئینہ ننگا ہے۔ یہاں پر کوئی

دیوان نہیں۔ کوئی غالیچ نہیں۔ ہوا میں تعطر نہیں۔ برآمدے میں پتھروں کی  
 بیلین نہیں۔ دروازوں پر چھیلی کے پرشے کیوں نہیں۔ یہ لوہے کی سلاخیں  
 یہاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ تمھارے محبوب کا مکہ ہے یا جیل خانہ۔ پیارے  
 اختر شاعر۔ بتاؤ تم کس کچھر کی اولاد ہو۔ تم کیا فتنے کیا ہو گئے۔ کدھر جا  
 رہے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس یہ جانتا ہوں۔ تم اپنے افلاس۔ اپنی غلامی  
 اپنی مصیبتوں کے خود ذمہ دار ہو۔ معاف کرنا۔ میں سامراج کا حامی نہیں  
 میں ڈیموکریسی کا سپاہی ہوں۔ کیا تم مجھ میں کسی قسم کی مغائرت کی  
 جھلک دیکھتے ہو؟  
 ”نہیں“

”تو بس جو میں کہتا ہوں اسے ٹھیک سمجھو۔ ہا ہا ہا اچائے پلاؤ گے۔“  
 ”ضرور۔۔۔۔۔ مگر ایک بات کہوں پال۔ تم جب بات کرتے  
 ہو تو تمھارا نچلا ہونٹ بڑے عجیب انداز میں آگے کو پھیل جاتا ہے  
 — موردس شولیر کی طرح۔“

”ہر فرانسیسی میری طرح دکھش انداز میں اسی دکھش انداز میں باتیں  
 کرتا ہے۔ یہ ہماری قومی خصلت ہے۔ چارلس بریاں کو فلموں میں کام کرتے



دیکھا ہو گا۔ آہ چارلس بریاں فرانسیسی اندازِ محبت کی تفسیر ہے۔ انگریز جب عشق کرتا ہے۔ تو کہتا ہے ”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ کس قدر پیچ انداز ہے یہ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں“ ”تم کس قدر حسین ہو“ یہ عاشق کی زبان نہیں ہے۔ بیکری کے مستری کی زبان ہے۔ جب فرانسیسی عشق کرتا ہے۔ تو خوشبوؤں کی زبان میں اپنے مطالب کا اظہار کرتا ہے۔ یا سمن ....

.... یا سمن .... ”اختر۔ اس کمرے کو جنسی کے پھولوں سے رشک گزار بنا دو۔ تاکہ جب تمہاری محبوبہ اٹھاتی ہو تو اس کمرے میں اگل ہو تو تم آنکھوں کی زبان میں خوشبوؤں کے سانسوں میں اس سے اظہارِ محبت کر سکو۔“

پال۔ میں چارلس بریاں کا وہ فقرہ کبھی نہیں بھولتا جو اُس نے اپنی عورت کی تعریف میں کہا تھا۔ ایک سادہ سا فقرہ ہے۔ لیکن اس سے بہتر جملہ محبت کی زبان میں آج تک ادا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ تم — تم میری محبوبہ نہیں ہو۔ تم پیرس ہو۔

”پیرس .... پیری .... پیری .... ہائے .... ہائے ....“

اس جملے پر سو جان۔ سے نثار ہوں۔ اختر تم اپنی محبوبہ سے کیا کہتے ہو جہاں ؟

”میں؟—— میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ بس خاموش بیٹھا اُسے

تکٹا رہتا ہوں۔“

”یہ ایشیا کی زبان ہے۔ محرومیت کی زبان ہے۔ خریب خلام

اور گھٹے ہوئے لوگوں کی زبان ہے۔ پیالے محبت کرنا سیکھو۔ تم خود بخود  
آزاد ہو جاؤ گے۔ سچ کہتا ہوں۔ یہ چائے بُری نہیں۔ لیکن پیالہ ٹوٹا ہوا  
ہے۔ تم لوگوں کا دل بُرا نہیں۔ لیکن یہ غول۔ یہ ماحول۔ یہ جسم اسے بدلنے کی  
ضرورت ہے۔ میں رنگ کا ذکر نہیں کر رہا۔ فرانسیسی قوم سفید رنگ کی  
قوموں میں پہلی قوم ہے جو جھنڈی کے رنگ سے پیار کرتی ہے۔ ہم لوگ  
دیوار رنگ میں یقین نہیں رکھتے۔ درحالیکہ امریکیوں کے ہاں بھی یہ دیوار  
موجود ہے۔ میں فرانسیسی ہوں۔ ڈیو کریسی کا سچا سپاہی..... اچھا  
تو یہ بتاؤ۔ تمہیں یورپین عورتیں پسند ہیں۔ کیوں شاعر..... تم سے تو  
پوچھنا بیکار ہے، اپنی محبوبہ.....“

”نہیں۔ اب ایسی بھی کیا بات ہے سفید رنگ کی عورتیں پسند تو ہیں۔“

”اور تم جاؤ۔“

”اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن ذرا ماحول..... جسم سے بدبو آتی ہے۔“

ویسے بڑی صحت مند ہوتی ہیں :

”اور تم شکاری۔ اچھا یہ بتاؤ۔ فلم ایکٹر سول میں تمہیں کونسی پسند ہے۔“  
”انگریڈ برگین“

سکندے نیوین ٹائپ ہے۔ یعنی بالکل تمہاری ضد۔ آدمی تضاد کو اتنا  
کیوں پسند کرتا ہے، شاید یہ برقی قوت انسان کے اندر بھی کارفرما ہے۔  
شاید یہ محبت بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مثبت اور منفی قوت کی لہریں  
اُن کا تضاد۔ محبت..... بد خوب..... ٹھیک تو ہے۔ مجھے دیکھو  
میں سفید رنگ کی عورت کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور انگریز عورت تو اس  
قدر بھدی ہے کہ بالکل نظر سے اتر چکی ہے۔ مجھے ہندوستانی عورت سے  
پیار ہے عشق ہے۔ والہانہ محبت ہے۔ میں ہر ہندوستانی عورت سے  
پیار کرتا ہوں۔ ہر ایک سے۔ مجھے ان کا رنگ پسند ہے۔ ان کے بال  
پسند ہیں۔ اُن کی چال پسند ہے۔ اُن کی ہنسی پسند ہے۔ اُن کی شفقت  
پسند ہے۔ اُن کی مامتا۔ اُن کی حیا، اُن کی سمجھ..... اُن کی مظلومیت...  
..... یہ یورپی عورت تو بھڑا بڑی بد صورت ہے۔ پوڈرا اور غازے میں  
یہی ہوتی، گندی اور اس کا سایہ اور ٹانگیں نکلی۔ اور نیلی نیلی رگیں۔ اور

چختے داغ..... اُن کس قدر گھناؤنا منظر ہے..... کہاں وہ دلفریب  
سایلوں کا بھاؤ جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی ریت پر..... وہ قم قم کا  
ٹیکہ..... شاید میں بھی تمہاری طرح اپنی ضد کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے  
ہندوستان میں صرف اندھرا کی عورتیں پسند ہیں، میں تو کسی ہندوستانی عورت  
سے شادی کروں گا۔

”بھوٹ بولتے ہو ہال۔ تم کسی فرانسیسی کنواری۔ کسی گیسکاں لڑکی  
سے شادی کرو گے اور جنگ کے بعد فرانسیسی شراب کی تجارت کرو گے۔  
ہندوستان میں بھلا تم کیا رہو گے؟“

”یہ سچ ہے۔ میں فرانس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن میں۔۔۔ میں ہندوستان  
کی ایک دیوی کو فرانس لے جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میرا ملک  
اس کا استقبال کرے گا۔ میرا خیال ہے میرے ماں باپ اُسے پسند  
کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ میں ہندوستان  
کی رُوح کو سمجھتا ہوں۔ اس لیے ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا  
ہوں۔ اُس کے لیے میں ایک چھوٹا سا مندر بنواؤں گا فرانس میں۔ یہ  
فرانس اور ہندوستان کی شادی ہوگی۔“

”وہ شادی جوڑے اور لالی اور نرملین نہ کر اسکا....!“  
 ”تم بھرتے ہو پائے میں وہ فرانسیسی نہیں ہوں۔ میں روس اور  
 والتیر کا فرانس ہوں۔ میں سامراجی نہیں ہوں۔ میں ڈیموکریسی کا سپاہی  
 ہوں۔ آؤ چلو کہیں چل کر تھوڑی سی شراب پیئیں۔ اور کسی ہندوستانی  
 لڑکی کا ناچ دیکھیں۔ مجھے ہندوستانی بازار بہت پسند ہیں۔ اور وہ  
 سُرخ سُرخ پرٹے جن کے اندر وہ ہندوستانی لڑکیاں ناچتی ہیں...  
 .... چھی ٹھم ... چھم ٹھم ... ٹاٹا ٹاٹا!“

”پال“

”ٹھم“

”یہ تھے کلیر کے بالے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“  
 ”بہت اچھا فلم ڈائریکٹر ہے۔ فرانس کا بہترین ہدایت کار۔ جسے  
 مائی وڈ نے تباہ کر دیا۔ یہی ہوتا ہے جب کوئی فرانسیسی اپنے ملک سے  
 باہر جاتا ہے۔ وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ قوم اسی طرح تباہ ہوئی ہے۔ تمہیں  
 معلوم ہے۔ میں رینے کلیر کا اسٹنٹ رہ چکا ہوں۔“

”نہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔“

”اُس کے لیے میں ایک کہانی بھی لکھ رہا تھا۔ پھر جنگ سر پڑ گئی۔  
اور سب کچھ رہ گیا۔“

”اُس کہانی میں کیا تھا۔“

”ماں اور بیٹی دونوں کو ایک ہی آدمی سے عشق ہے اور یہ آدمی  
اُس کی ماں کا ناجائز خاوند ہے یعنی اس بیٹی کا باپ۔“  
”بہت خوب۔ پھر کیا ہوتا ہے۔“

”پھر — مگر یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ آخر میں یہ ہوتا ہے۔ کہ بیٹی  
اور باپ خاوند اور بیوی کی طرح ہوتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ شادی نہیں ہو سکتی مگر  
اس سے کیا ہوتا ہے۔ محبت لزوال ہے — بیوہ! دو لارچ و سکی لاؤ.....“  
”ہال تم آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟“

”ایک بات ہے تمہیں بتانا چاہتا تھا، مگر میں نے سوچا چوتھے  
پیگ کے بعد بتاؤں گا۔“  
”کہو۔“

”میں کل صبح ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں فرنگی سیرٹ

جارا ہوں :

• اس میں خوشی کی کیا بات ہے ؟

”یہی کہیں فرنج سیریا جارا ہوں۔ ہندوستان پھوڑا ہوں۔ وہاں  
بے بھروسہ کام نظر شروع ہوتا ہے۔ پیرس دو قدم پر ہے اور پھر کچ پھوڑا  
وہ فرنج سیریا ہے۔ اپنا ملک ہے۔“

”ہال وہ تمہارا ملک کس طرح ہے ؟  
”کیا کہتے ہو تم ؟“

”غور کرو۔ فرنج سیریا۔ تمہیں ان لفظوں میں کچھ دکھائی دیتا ہے۔ باہر  
سے مت پڑھو ان لفظوں کو۔ انہیں اندر سے پڑھو پال۔ فرنج سیریا....  
فرنج کیوں تمہیں اس میں کوئی عجیب بات نظر آتی ہے۔ فرنج سیریا  
برٹش انڈیا، ڈچ بریو، تمہیں ان خوش رنگ، چمکتے ہوئے الفاظ کے پڑو  
میں کہیں تاریکی کی جھلک نظر آتی ہے ؟  
”لو سکی پیو....“

”پال تم کل جا رہے ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔ تم ایک ذہین فرانسیسی  
ہو۔ تم یورپ کے کلچر۔ تہذیب اور مذہب کا بہترین آئینہ ہو۔ شراب پیو،

دوست تم کل فریج سیر یا جا ہے ہو۔ تاہم کایہ تو اترو ڈھ دو سو برس سے چلا آ رہا ہے۔ ڈیڑھ دو برس کیا ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ دو دن ڈیڑھ دو لمحے، کچھ بھی نہیں دوست۔ پھر اگر کل کو یہ تو اترو بدل جائے۔ اور کوئی سہا ہی تم سے کہے میں جیسی فرانس۔ ہندی برطانیہ اور جیسی اطالیہ میں جا رہا ہوں۔ تو تمہیں خوشی حاصل ہوگی؟

”بہت پی گئے ہو شاید پی کر تمہارا احساس کتری بڑھنے لگتا ہے۔“  
 ”احساس کتری نہیں۔ احساس برتری بول رہا ہے۔ آج معلوم ہوا تم کتنے چھوٹے ہو۔ تمہاری تہذیب وقتی ہے۔ تمہاری خوشی وقتی ہے تمہاری فوقیت وقتی ہے دوست تم مر چکے ہو۔ کیونکہ تم نے اپنے دل میں نا انصافی اور ظلم اور بے رحمی کو جگہ دی ہے۔ ذلیل ہندوستانی!.....“  
 ..... پال مجھے گھونسا مت دکھاؤ، اُسے اُس ہندوستانی عورت کے لیے سنبھال کر رکھو۔ جس کے لیے تم فرانس میں مندر بنا رہے تھے۔ وہ مندر کب کا سمار ہو چکا۔ وہ مندر جس میں روسو اور والٹیر کی رُوح نے جہنم یا عیا میں ذلیل ہوں لیکن زندہ ہوں۔ تم ارفع ہو لیکن مر چکے ہو۔ اور مجھے مُردوں سے کوئی ملاؤ نہیں جاؤ فریج سیر یا جاؤ، یا ڈیج السرفیہ،



تیسری جنگِ عظیم تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جس طرح دن کے بعد رات  
 آتی ہے۔ اُسی طرح وقتی صلح کے بعد پھر جنگ آئے گی۔ کیونکہ پال تم  
 ابھی تک نفرت کے قبرستان میں سو رہے ہو۔ مجھے روکو نہیں۔۔۔  
 مجھے بولنے دو۔ آج میری باری ہے اور تم فریج سیریا جا رہے ہو اور  
 ہم دونوں دسکی پی رہے ہیں، ایک زندہ ایک مردہ۔ ایک ذلیل، ایک  
 بے رحم، بٹھراؤ پال۔۔۔ یہاں سے اٹھ کر کہاں جا رہے ہو۔۔۔ اپنے  
 دوست کا آخری سلام تو لیتے جاؤ۔۔۔ سنو میں اکیلا نہیں ہوں پال،  
 میں چالیس کروڑ ہوں۔۔۔ میں نفرت نہیں ہوں میں محبت ہوں۔ میں  
 نبولین نہیں ہوں۔ میں اشوک ہوں۔ میں اکبر ہوں۔ میں گوتم ہوں چشتی  
 ہوں۔ کبیر ہوں کبیر کا نام سنا ہے تم نے؟ سنئے جاؤ پال، میں اجنتا ہوں  
 ایلورا ہوں۔ میں تاج محل ہوں۔۔۔ میں محبت ہوں۔ عشق و انسانیت  
 کی تفسیر ہوں، تم آزاد ہو کر بھی محبت نہیں کر سکتے۔ میں غلام رہ کر بھی  
 تم سے محبت کرتا ہوں، میرا گھر بڑا ہے۔ میرا اول بڑا ہے، میری روح  
 عظیم ہے۔۔۔۔۔ بٹھراؤ پال۔ یہ چنیل کے پھولوں کا ہار لیتے جاؤ۔  
 ایک ذلیل ملک کا آخری تحفہ۔۔۔ سنو۔۔۔ سنو پال پال!

میں تمہیں اُس قیصری جنگِ عظیم سے بچانا چاہتا ہوں۔ سنو پال۔ مجھے تم سے  
 نفرت نہیں ہے..... مجھے تم سے نفرت نہیں ہے.....!“

## غالیچہ

اب تو یہ غالیچہ پرانا ہو چکا، لیکن آج سے دو سال پہلے جب میں نے اسے حضرت گنج میں ایک دکان سے خریدا تھا اُس وقت یہ غالیچہ بالکل معصوم تھا، اس کی جلد معصوم تھی، اس کی مسکراہٹ معصوم تھی، اس کا ہر رنگ معصوم تھا، اب نہیں، دو سال پہلے، اب تو اس میں زہر گھل گیا ہے، اس کا ایک ایک تار مسموم اور متعفن ہو چکا ہے، رنگ ماند پڑ گیا ہے، تبسم میں آنسوؤں کی جھلک ہے، اور جلد میں کسی آتشک زدہ مریض کی طرح جا بجا گڑھے ٹھکانے ہیں، پہلے یہ غالیچہ معصوم تھا۔ اب قنوطی ہے، زہر خندہ منہی مہنتا ہے، اور اس طرح سانس لیتا ہے، جیسے کائنات کا سارا کوڑا کرکٹ اس نے اپنے

سینے میں چھپا لیا ہو۔

اس خالیچے کا قد نو فٹ ہے، چوڑائی میں پانچ فٹ، بس جتنی ایک اوسط درجے کے پٹنگ کی چوڑائی ہوتی ہے، کنا راہ کو زیادہ امی ہے اور ڈیڑھ انچ تک گہرا ہے، اس کے بعد اہل خالیچہ شروع ہوتا ہے اور گہرے سرخ رنگ سے شروع ہوتا ہے، یہ رنگ خالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے اور دو فٹ کی لمبائی میں ہے، گویا  $2 \times 5$  فٹ کی مستطیل، سرخ رنگ کی ایک جھیل بن گئی ہے، لیکن اس جھیل میں بھی سرخ رنگ کی جھلیاں، کئی رنگوں کے تماشے دکھائی ہیں، گہرا سرخ، گلابی، ہلکا قرمزی، اور سرخ جیسے گندہ خون ہوتا ہے، لیٹتے وقت خالیچے کے اس حصے پر میں ہمیشہ اپنا سر رکھتا ہوں، اور مجھے ہر بار زیر احساس ہوتا ہے، کہ میرے سر میں جو نکلیں لگی ہیں۔ اور میرا گندہ خون چوس رہی ہیں۔

پھر اس خونی مستطیل کے نیچے پانچ اور مستطیلیں ہیں، جن کے الگ الگ رنگ ہیں۔ یہ مستطیلیں خالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلی ہوتی ہیں، اس طرح کہ آخری مستطیل پر خالیچے کی لمبائی بھی ختم ہو جاتی ہے، اور دوری کی کہ شروع ہوتی ہے۔ .... خونی مستطیل کے بالکل نیچے تین چھوٹی چھوٹی

مستطیل میں، پہلی سپید اور سیاہ رنگ کی شطرنجی ہے۔ دوسری سپید اور نیلے رنگ کی، تیسری بلیک اور خاک رنگ کی، یہ شطرنجیاں دو وسطے ٹاکل چھپک کے داغوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں، اور قریبے دیکھنے پر بھی ان کے حسن میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نیلام شدہ پرانے گرم کوٹوں کی جلد کی طرح میلی میلی اور بد نما نظر آتی ہیں۔ پہلی مستطیل اگر خون کی جھیل ہے تو بہتین چھوٹی چھوٹی مستطیلیں مجموعی طور پر پیپ کی جھیل کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ان کے سپید، کالے، پیلے، بلیک رنگ پیپ کی جھیل میں گڈ بڑھتے نظر آتے ہیں، اس جھیل میں میرے شانے، میرا دل، اور میرے بھپڑے پسلیوں کے کبھی ہیں دھڑے ہوتے ہیں۔

چوتھی مستطیل کا رنگ پیلا ہے، اور پانچویں کا سبز ہے، لیکن ایسا سبز ہے جیسے گرے سمندر کا ہوتا ہے، ایسا سبز نہیں جس طرح موسم بہار کا ہوتا ہے یہ ایک خطرناک رنگ ہے، اسے دیکھ کر شارک مچھلیوں کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ڈوبتے ہوئے جہاز رانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں، اور اچھلتی ہوئی طوفانی، دیو ہیکل لہروں کی گونج اور گرج رعشہ پیدا کرتی ہے، اور پیلا ٹیلا لا رنگ تو سنو سنو۔ یہ رنگ زعفران کی طرح، بسنت کی طرح پیلا نہیں

## غالیچہ

یہ رنگ مٹی کی طرح پیلا ہے، تپتق کے لرغ کی طرح پیلا ہے، پہلے گنا کی طرح زرد ہے، ایک ایسا زرد رنگ جس میں شاید اک ہلکا سا احساس ندامت بھی شامل ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مستطیل بار بار کمرہ ہی ہو۔ میں کیوں ہوں، میں کیوں ہوں.....!

جہاں میں اپنا احساس رکھتا ہوں، اُس کے دائیں کونے میں نیلے اور پہلے رنگ کے دس خطوط وحدانی بنے ہوئے ہیں، اور جہاں میں اپنے پاؤں پسار کے سوتا ہوں، وہاں گیارہ خطوط وحدانی ہیں۔ یہ پہلے اور فیروزی رنگ کے ہیں، غالیچے کے وسط میں چھ خطوط وحدانی سرخ و سپید رنگ میں ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گہرا سیاہ نقطہ ہے..... جب میں غالیچے پر لیٹ جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سرے پاؤں تک کسی نے مجھے ان خطوط وحدانی کی بکوں میں جکڑ لیا ہے۔ مجھے صلیب پر لٹا کر میرے دل میں ایک گہرے سیاہ رنگ کی میخ ٹھونک دی ہے، چاروں طرف گندہ خون ہے، پیپ ہے، اور سبز رنگ کا سمندر ہے جو شارک مچھلیوں اور سمندری ہزار پاؤں سے معمور ہے، شاید مسیح کو بھی صلیب پر اتنی ایذا پہنچی ہوگی، جتنی مجھے اس غالیچے پر بیٹھے وقت حاصل

ہوتی ہے، لیکن ایذا پہنچی تو انسان کا شیوہ مہیچہ، اسی لیے قریر غالیچہ میں اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ نہ اس کی موجودگی میں مجھے کوئی اور غالیچہ خریدنے کی جرأت ہوتی ہے، میرے پاس ہی ایک غالیچہ ہے اور میرا خیال ہے کہ مرتے دم تک یہی ایک غالیچہ رہے گا۔

اس غالیچے کو دو اصل ایک خاتون خریدنا چاہتی تھی، حضرت گنج میں ایک دکان کے اندر وہ اسے کھلوا کر دیکھ رہی تھی، کہ میری نگاہوں نے اسے پسند کر لیا، اور وہ خاتون کچھ فیصلہ نہ کر سکی اور اسے وہیں چھوڑ کر اپنے بلاؤز کے لیے ریشمی کپڑے دیکھنے لگی۔

میں نے منہجہ سے کہا: ”یہ غالیچہ میں خریدنا چاہتا ہوں۔“  
وہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ”مس روپ وقی — شاید اسے پسند کر چکی ہیں۔ شاید! —“  
نھٹھریئے۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں۔

روپ وقی بولی: ”غالیچہ — بُرا نہیں!“  
”بُرا نہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے بھڑک کر کہا: ”ایسا غالیچہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہوگا۔ دانستے کے تخیل نے بھی ایسا نقشہ

تیار نہ کیا ہوگا، یہ غالیچہ ہسپتال کی گنری بالٹی کی طرح حسین ہے، امراضِ خفیشہ کی طرح رُوح پرور ہے، یہ آگ اور پیپ کا دوا یا حاتم طائی کے سفر کی یاد دلاتا ہے۔ قدیم اطالوی راہب مصوروں کے شاہکاروں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ غالیچہ نہیں ہے۔ تاریخ ہے، انسان کی رُوح کی!“

وہ مسکرائی، دانت بے حد سفید تھے، لیکن ذرا ٹیڑھے میڑھے، اور ایک دوسرے سے بہت قریب، پھر بھی وہ مسکراہٹ اچھی معلوم ہوئی کہنے لگی: کیا آپ کبھی اٹلی گئے ہیں؟“

میں نے کہا: ”اٹلی کہاں! میں تو کبھی حضرت گنج کے اس پار نہیں گیا۔ عمر گزری ہے، اسی پرانے میں، یہ پان کی کان ہے اور سامنے وہ کافی ٹاؤس“۔  
مینجر نے اب تعارف کرانا مناسب سمجھا۔ بولا: ”آپ آرٹسٹ ہیں۔ کاغذ پر تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ مس روپ قتی ہیں۔ یہاں لڑکیوں کے کالج میں پرنسپل ہو کر آئی ہیں۔ ابھی انگریڈ سے تعلیم حاصل کر کے یہاں....“  
وہ بولی: ”چلتے تو یہ غالیچہ آپ ہی لے لیجئے مجھے تو خاص پسند نہیں۔“  
”آپ کا بڑا احسان ہے“ میں نے غالیچہ کی قیمت ادا کرتے ہوئے کہا: ”کیا آپ میرے ساتھ کافی پینا گوارا کریں گی، چلتے تو ذرا کافی ٹاؤس



تک، اگر ناگوار خاطر، یعنی —

”شکریہ۔ مگر میں فوراً یہ بلاؤز دیکھ لوں۔“ وہ پھر مسکرائی۔

مسکراہٹ بھی بھلی معلوم ہوئی، ذہین بیضری چہرے کا رنگ نہ تھا،  
صندلی رنگ پر لبوں کی ہلکی سی سُرخی اک عجیب سیلا توج سا پیدا کر  
رہی تھی بلاؤز کا کپڑا خرید کر جب وہ میرے ساتھ چلنے لگی، تو لڑکھڑا گئی۔  
میں نے ہاندرے پکڑ کر سہارا دیا اور پوچھا ”کیا بات ہے۔ کیا آپ ہمیشہ  
لڑکھڑا کر چلتی ہیں؟“

وہ بولی ”نہیں تو۔۔۔۔۔“ میں نے غور سے دیکھا۔ پاؤں پر پیٹی بندھی  
ہوئی تھی۔

”زخم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اے! انگوٹھے کا ناخن بڑھ گیا تھا۔ جلد کے اندر۔۔۔۔۔ جہاز کا سفر  
بالکل گدھا تھا۔۔۔ اُس نے ہاتھ پر ساری کا پلو مسرکایا اور جب وہ پہلی بار  
ٹری تو میں نے دیکھا اُس کے بالوں میں گرڈن کے قریب ایش طرف کلاپ کے  
زرد پھول ٹپکے ہوئے تھے، پھر جب وہ مڑی تو ہاتھ کا قلم قم درخشاں  
نظر آیا۔ اس سے پہلے کیوں یہ قلم قم اس قدر خوبصورت نہ تھا؟

کافی ناؤس میں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت تھی، کچھ تو کافی ناؤس میں روشنی کا انتظام ایسا ہے کہ مرد بہ صورت نظر آتے ہیں، عورتیں حصی تر پھر۔ ہاں۔ کچھ تو تھا، ورنہ یہ لوگ بار بار ڈر کیوں دیکھتے تھے، عورتیں تیز نگاہ سے کیوں گھورتی تھیں، جسے اتنی جلدی مینر پر کیوں آ جاتے تھے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی۔۔۔ ”دیکھو ہیرا، تھوڑا سا گرم دودھا اور گرم پانی ایک انگ پیالے میں۔“

”گرم پانی تو۔۔۔“ ہیرے نے رک کر کہا۔

”تھوڑا سا گرم پانی، بس ا“ وہ پھر مسکرائی، اور ہیرا سر سے لے کر پاؤں تک پگھل گیا، جیسے اُس کا سارا جسم شیشے کا بنا ہو، میں اُسے پگھلتے دیکھ رہا تھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، اور اُس کے سارے جسم کو پگھلاتی ہونٹ چلی گئی، یہ نگاہ کیا ہے؟ یہ تجلی کیسی ہے؟ کیا یہ کافی ناؤس کی بجلیوں کا شعبہ تو نہیں؟

”اور ہیرا۔۔۔ انڈے کے سینڈوچ ا“ وہ پھر بولی۔

ہیرے نے واپس آ کر کہا: ”جی انڈے کے سینڈوچ تو ختم ہو گئے۔“

”تھوڑے سے بھی نہیں؟“ اُس کی بڑی بڑی معصوم زخمی سی آنکھیں

غالیچہ

اور بھی کھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، بس لاچار! ایک پلیٹ بھی نہیں ہے  
سینڈویچ بھی مل گئے۔

”نہیں بل میں ادا کروں گی“

”نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں مرد ہوں۔“

وہ ہنسی ”بہت پرانی بات ہے“ اور اس نے بل ادا کر دیا۔

گھر پر نوکر کو غالیچہ پسند نہ آیا۔ ان دنوں ایک شک مزاج شاعر سہان  
تھا جو آزاد بکھر میں نظمیں لکھا کرتا تھا۔ خراب پیتا تھا اور پانچ وقت نماز ادا  
کرتا تھا، اُسے بھی غالیچہ پسند نہ آیا۔ میں نے پوچھا تو بس ”ہوں“ کر کے رہ  
گیا، وہ نظمیں جتنی لمبی لکھتا تھا، باتیں اُسی نسبت سے کم کرتا تھا۔

”ہوں“ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے چڑ کر کہا: ”کچھ تو کہو ان ہنگوں

کا تناسب“

”ہوں“

”وہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔“

اُس بڑے بڑے شاعر سے کہنے لگی: ”پن تازہ نظم مٹاؤ.... تمہیں معلوم ہے

آج کل اسپنڈرا و دلاڈن اغلامیت کے حق میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔

”ہوں“ وہ اپنی داڑھی پر ہات پھر کر غرا یا۔

میں نے روپ سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا ان لوگوں

نے تمہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں؟“

”نہیں۔ لیکن مجھے جو نے بتایا تھا۔“

”کون؟ جو؟“

”جو براؤن، نام نہیں سنا ہے کیا؟ آج کل آکسفورڈ کا محبوب ترین

شاعر ہے، ہندوستان میں ابھی اُس کا کلام نہیں پہنچا، لندن میں مجھ پر عاشق

ہو گیا تھا، وہ کچھ عجیب، کچھ بیاک، کچھ شرمیلی سی مہنسی کے ساتھ کہنے لگی، او

ماتھے کا قم قم یا قوت کی طرح دکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہاری زندگی فتوحات سے پر معلوم ہوتی ہے؟“

”نہیں؟“ اُس نے آہ بھر کر کہا۔ اس طرح کہ میرا جی چاہا اُسے گلے

سے لگاؤں۔

”ہوں“ شاعر بولا۔

روپ مسکرا کر کہنے لگی۔ ”تمہارا شاعر بہت باتونی ہے۔۔۔۔۔“

..... سنو..... تمہیں ایک نظم سنائی ہوں ۔

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی میں نے پوچھا : تم شاعر بھی ہو ۔

”نہیں یہ نظم میری والدہ نے کہی تھی ۔“

”مٹھرو۔ مجھے یہ غالیچ کچھا لینے دو۔“

غالیچ کچھ گیا اور نظم روپ نے کاکرستانی، بنگالی نظم تھی، اُداس مخدوں  
شبِ فراق کی جلی ہوئی، شمع کی طرح خوبصورت تھی، آواز شعلے کی طرح  
لرزاں، تاثر شراب کی طرح خمار انگیں، بنگالی دوشیزائیں قطار اندر قطار  
گھرے اٹھائے ہوئے گھاٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ سمندر کی ہنر لہریں  
اچھل رہی تھیں۔ شرجی کا ڈمرو بج رہا تھا، پارہی رقص کر رہی تھیں، برف گر  
رہی تھی،..... اب فضا خاموش تھی اور روپ کی آنکھوں میں آنسو تھے  
..... آنسو رخساروں سے ڈھلک کر غالیچ پر گر پڑے، اور وہ سرخ  
مستطیل جیسے آگ کا شعلہ بن گئی۔...!

”تمہیں جو براؤن سے عشق نہیں ہوا۔ میں نے پوچھا ۔

روپ نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولی مجھے جس لڑکے سے عشق تھا

اُسے لندن ہی میں تپ دق ہو گیا تھا۔ وہ جہاز پر میرے ساتھ آ رہا تھا، لیکن

راستہ ہی میں اس کی موت ہو گئی، عدلی سے پرے بحیرہ سرخ میں!“  
 ”بحیرہ سرخ“ میں نے سوچا۔ اور غالبؔ کی سُرُخِ مستطیل بحیرہ سرخ  
 بن گئی، اور اس کے گہرے پانیوں میں مجھے اک زرد رُو کھانسا ہوا چہرہ نظر  
 آیا، اور پھر بھنور میں غائب ہو گیا، محض خواب ہے۔ محض خواب ہے رُحِ پاک  
 محبوب، سرخ سمندر کے پانیوں میں، اور روپ کے آنسو میرے غالبؔ کی  
 بد گرائے ہیں۔۔۔۔۔“

”ہوں و شاعر نے کہا۔ اور میں نے ایک کتاب اس کے سر پر ڈالی“  
 روپ آنسوؤں میں سکر اوی، بعض اوقات آنسو رونے سے آنسو مینا  
 زیادہ اندوہناک معلوم ہوتا ہے!

روپ!

کیسی عجیب سی لڑکی تھی وہ، لندن میں شاعر جبرائیل اسے محبت کرتا  
 تھا، اور لکھنؤ میں حضرت گنج کا یہ آوارہ مزاج غریب آرٹسٹ اس کی محبت  
 میں گرفتار ہو گیا، یہ جانتے تھے بھی کہ یہ زہر ہے، وہ کس طرح اس پہلے  
 کو پی گیا، یا سیت، نامزدی بے بسی، عشق کا جواب ہمیشہ عشق کیوں

نہیں ہوتا، یہ کیسی آگ سے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برکت کی سل بن جاتی ہے جو محروم تما کو آنسو لاتی ہے اور جانی تما کے لبوں پر قسم ریز سایہ بھی نہیں لاسکتی۔

میں نے غالیچ کو تھپکتے ہوئے پوچھا۔

غالیچ نے کہا۔ میں صلیب ہوں، میں دکھ اور درد جانتا ہوں، دکھ

اور درد کی دوا نہیں جانتا!

اور روپا نے کہا: ”یہ قسمت ہے، قسمت تمہیں غالیچ خریدنے کے

لیے دیاں لے گئی، قسمت نے تمہیں مجھ سے روشناس ہونے کا موقعہ دیا، اب

یہ تمہاری قسمت ہے کہ مجھے تم سے وہ محبت نہ ہو سکی، ہزار کوشش کرنے پر

بھی یہ رفاقت محبت میں بدل نہیں ہو سکتی۔ یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر کہنے لگی: ”شاعر اپنے شعر سناؤ۔“

چند روز کے بعد اس نے یکایک مجھ سے کہا: ”مجھے تمہارے شاعر

سے محبت ہو گئی ہے۔“

”جھوٹ..... اس چنڈے.....“

اس کی آنکھیں دیکھیں تم نے: ”وہ آہ بھر کر بولی: ”جیسے مسخ دار پر

لٹکا ہر کتہا اندوہ ہے آن میں!

میں نے کہا: اگر تم کہو تو میں اپنی آنکھیں اندھی کروں۔  
 شاید میری تلخی اُسے ناگوار گزری۔ سنجیدہ رُو ہو کر بولی: کیا کروں؟  
 ”ہاں دل ہی تو ہے!“ میں نے طنزاً کہا۔  
 ”ہوں“ شاعر بولا۔

جس روز وہ دونوں رخصت ہوئے، میں نے گھر پر ایک چھوٹی سی  
 دعوت دی، روپے ڈھاکے کی سیاہ ساری پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں  
 کاجل گھرا تھا۔ دیشمی چوڑیوں کا رنگ بھی سیاہ تھا، ہر روز اُسے دیکھ کر اُجھالے  
 کا، سوُج کا، چاند کا، چاند کی کرن کا، روشنی کا احساس ہوتا تھا۔ نہ جانے آج  
 اُسے دیکھ دیکھ کر کہیں تاریکی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیوں وہ اس اپنی مکمل  
 کھمرانی کے لمحوں میں بھی ٹھہم پاس و غم کی تصویر دکھائی دیتی تھی کیا یہ  
 غریب آرٹسٹ کے دل کا اندھیرا تو نہیں تھا۔ کیا یہ اُس کے بُرش  
 کی تاریکی تو نہ تھی! آج میں نے اُس سے وہی گیت سننے کی تمنا کی تھی جو اس  
 نے پہلے روز گایا تھا..... مجھے یاد ہے گانے کے بعد وہ ناچی بھی تھی  
 میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، میں اس کے پاؤں دیکھتا رہا، دھندلے



دھندلے تاریک سے پاؤں جن میں حنا کی سُرخ کھیر بھلی کی طرح چمک چمک جاتی تھی، اُس تاریکی میں صرف یہاں روشنی تھی، وہ ناچتی رہی، اور میں اُس تاریکی میں حنائی کھیر کا ناچ دیکھتا رہا۔ اور جب ناچ بھی بند ہو گیا تو میں نے وہ پاؤں اٹھا کر اپنے سینے میں لکھ لیے، کیونکہ وہ پاؤں آج تک اس سینے میں محفوظ ہیں..... کیا اس اہرام میں میموں کے سوائے اور کسی کے لیے جگہ نہیں؟

جب وہ چلی گئی تو میں پھر غالیچے پر اکھ بیٹھا، زرد گلاب کی ایک کلی اس کے جوڑے سے نکل کر غالیچے پر پڑی رہ گئی تھی..... میرے دل میں شاید اب روپ کی کوئی یاد باقی نہیں، صرف یہ دو پاؤں ہیں اور اک یہ گلاب کی زرد کلی..... کیسی تصویر ہے یہ؟ مصوّر ہو کر بھی میں نے شاید ایسی عجیب تصویر اس سے پہلے کبھی نہ بنائی تھی..... پھر!

میں غالیچے سے پوچھتا ہوں۔

غالیچہ کہتا ہے: ”میں تو صلیب ہوں، صلیب موت بخشی ہے، اُسے زندگی کی ترتیب، تناسب، توازن سے آگاہی نہیں.....“

اچھا اسے بھی جانے دو جو ہوا سوہا، اگر زندگی میں قبر ہی کا مزہ لینا ہے  
 تو کیوں نہ اسے آرام سے جا مل گیا جائے، اگر شہد میں زہری ملا کے مینا ہے  
 تو کیوں نہ خالص نہر پیا جائے، اگر مصورتیت برقرار نہیں رہ سکتی، تو کیوں  
 نگہری مصیبت کی آغوش میں پناہ لی جائے، آؤ، اپنے دل میں ضمیر کی جواک  
 بجلی سی شمع رہ گئی ہے اسے بھی خاموش کر دیں اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں گناہ  
 کے پھیلنے سمجھئے دو دو دکھیں اور زندگی کا منہ چڑائیں اور قہقہے نکالیں۔  
 محبت نہ سہی، براہموسی سہی!

آرٹسٹ نے مک اور لڑکی سے آشنائی پیدا کر لی جو ویکسٹن ڈام  
 تھی، اس کا نام تھا آشا، لیکن صورت پر بالکل نرساہ رستی تھی، ایسی بھونکی  
 لڑکی تھی وہ، کبھی مرد دیکھا ہی نہ تھا، گتیا کی طرح ساتھ ساتھ لگی پھرتی تھی،  
 بے پھاری، آرٹسٹ کو شاید اس پر رحم آنے لگا تھا، وہ اس کے ساتھ شفقت برتنے  
 لگا، اک مرتبہ نہ پورا انداز کے ساتھ اب وہ اسے برنگر لیے لیے چہرتا،  
 لوگ طنز آس کے حسن انتخاب کی داد دیتے تھے، اور وہ بظاہر بڑے خلوص سے  
 داد قبول کرتا، کوئی کہتا، جیسی، بڑی بد صورت ہے وہ، تم نے کیا سوچ  
 کر۔ تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتا، گھنٹوں اس کی خوب بوٹی کا بوجھ کرنا کرتا، کوئی

اُس نے اُشاک کی تصویر بنائی تھی اور اپنے سٹوڈیو میں ہر کس ونا کس کو وہ تصویر دکھاتا تھا۔ وہ اپنے زخم دکھا رہا تھا۔ دیکھو..... دیکھو..... دیکھو..... مجھے تمھاری کیا پروا ہے..... میں اپنی روح کا آپ مالک ہوں.....

..... زہر خندا!..... کوئلے!

لیکن وہ جو کبھی حضرت گنج کے اُس پار نہ گیا تھا۔ اب وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا، فٹ پاتھ پھٹ پھٹ چلتے چلتے وہ ہزاروں اٹلے سیدھے خواب دیکھنے لگا، رگنڈر کے ہر پتھر پر اُسے کسی کے پیروں کے دھندلے دھندلے سائے کھینچتے ہوئے معلوم ہوتے، کافی کی پیالی کے ہر سانس میں وہ اُس کے گرم سانس کا مس محسوس کرتا، اور برقی شعلوں کے براق اجلاہ میں اسے ہزاروں قم قم تیرتے ہوئے دکھائی دیتے، یہ ہنسی؟ وہ مڑ کر دیکھتا کہاں سے آئی تھی، لیکن یہ تو وہی کشمیری پالتو مینا اپنے پنجرے میں چپک رہی تھی، بلبل قفس کی نیلیاں تو مڑ کر پرواز کر گئی تھی اور وہ ابھی تک کیوں حضرت گنج کے ویرانے میں مقید تھا... کیوں؟ کیوں؟ وہ حنائی لکیر بار بار بجلی کی طرح چمک کر اس سے بار بار پوچھ رہی تھی!

اب جبکہ وہ شہر چھوڑ کر جا رہا تھا اس نے اپنے سب ستوں کو اس

دیک لڑکی کو، اور اُس کی سب سہیلیوں کا آخری دعوت دی تھی، اور جب دعوت کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ تو دیک لڑکی حیران و پریشان اسی غالیچے پر بیٹھی رہی تھی، اور پھر یکایک اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی تھی، یہ گرم گرم آنسو جو اُس کے سینے میں برف کے پھول بنے جا رہے تھے، عشق کا جواب عشق کیوں نہیں ہوتا، یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی بل بن جاتی ہے۔

ایک لڑکی غالیچے پر بیٹھی تھی، بازو اوپر کے خطوط و صفائی کے ٹک میں تھے پاؤں نیچے کے خطوط و صفائی میں، غالیچے نے چپکے سے اس کے دل میں اک سیاہ میخ ٹھونک دی، ابرام کے ایسے ایک اور می تیار ہو گئی، لیکن وہاں جگہ کہاں تھی، سینے میں اب بھی وہی دو پاؤں ناچ رہے تھے.... اور وہی گلاب کی اک زر دکلی!

میں نے غالیچے سے پوچھا: ”کیسا کھیل ہے؟ میں کس کا منہ چڑا رہا ہوں؟ زخم کس کے ہیں، یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے؟ اگر یہ سب قسمت ہے، تو پھر یہ کاوشِ پیہم کیا ہے جو می کو بھی زندہ کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔“ غالیچے نے جواب دیا: ”مجھے معلوم نہیں۔ میں تو ایک صلیب ہوں۔“

## غالیچہ

جودل میں سیاہ کیل ٹھونکتی ہے، سپید روشنی نہیں لاتی، جو قسمت کا انجام دکھاتی ہے، اُس کا آغاز و شباب نہیں!  
تجھے جلا کر خاک نہ کر ڈالوں!

اس نئے شہر میں!  
چار آدمی غلیچے پر تاش کیل رہے ہیں۔  
دو ایکٹر  
دو تجارتار

اور جو تاشا دکھا رہا ہے وہ آرٹسٹ ہے!  
تاش کھیلے کھیلے ایکٹر اور تجارتار لڑنا شروع کرتے ہیں، ہاتھ پائی کی نوبت آتی ہے، غالیچہ نوچا جاتا ہے، کیونکہ ایکٹ جال میں ایک تجارتار غلطی سے یا جان بوجھ کر آٹھ آنے زیادہ لے گیا تھا، میرا گریبان تار تار رہ چکا ہے، کیونکہ جو آدمی لڑائی رفع کرنا چاہتا ہے، دہری سب سے زیادہ ہٹتا ہے۔  
پھر میں سوچتا ہوں۔ اس بدفرنگی کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہے، بد لکھی، ناممکن! گراموفون؟ واہیات! اچائے! العنت! شراب، سہان اللہ!

سب لوگ شراب پی رہے ہیں، آرٹسٹ کی آنکھیں سُرخ ہیں، ہمیشہ ہنسنے اور خوش رہنے والا خوش شکل ایکٹر ہمیشہ چسپہ ہنسنے والے قبولِ صورت ایکٹر سے کہہ رہا ہے: ”محبت، محبت؟ سالانہ محبت کیا جائے؟ ابھی کالج کا نوٹڈا ہے تو..... ایس..... محبت کا نشہ مجھ سے پوچھ..... سالی؟“ شراب بھی بالکل تلخ نہیں ہے۔۔۔ رانی کو دیکھا ہے تو نے؟“

”رانی سنو ۱۹۴۲ء کی بہترین ایکٹرس ہے نا؟ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، وہ۔۔۔ دہری۔۔۔ سالانہ تو کیا اہل خانہ..... وہ میری محبوبہ

ہے..... سمجھے؟..... ایس؟ میں نے اس کے لیے اپنے ماں باپ

کی گایاں کھائیں..... بکٹی ٹھانیاں ٹریں رقیبوں سے..... اپنا گھر بار

چھوڑ دیا..... یہ لگو ٹھی شلے دیکھتے ہو، یہ قمیض کے ٹن، یہ کف ٹن۔

یہ سب سونے کے ہیں، شلے تو کیا جلنے... یہ سب اس نے دیے ہیں۔

.... تحفے.... مگر میں اس سے شادی نہیں کروں گا کبھی نہیں کروں گا۔

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”کیوں؟“

وہ مجھے چاہتی ہے۔ پر وہ مجھ سے بہت امیر ہے.... وہ چاہتی ہے۔

کہ مجھ سے شادی کرے۔ پر میں مرعاضوں گا، اس سے بیاہ نہیں کروں گا۔  
 تمہیں اس سے محبت نہیں یا؟ ایک تجارتی پرچھا۔

”لیکن بھی بگمراہی دولت کیوں چھوڑتے ہو؟ دوسرے تمہارے پرچھا۔  
 ایکسٹرنل مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ”میں جو ہوں وہی رہوں گا۔ میں اُس سے  
 محبت کرتا ہوں، لیکن اس کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں اُس کی محبت  
 چاہتا ہوں۔ دولت نہیں! الخ!“ ایکسٹرنل نے زور سے غالیچ پر ہات مار  
 کر کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا!

غالیچ کانپ اٹھا۔ اُس کا رنگ عجب سا ہو گیا۔

”اور شراب سے سحر اترائے!“ وہ اپنے خالی گلاس کو ٹٹول رہا تھا۔  
 میں نے کہا: ”رانی، اسے بھی آج ہی تو میں نے اخبار میں پڑھا ہے  
 کہ رانی نے ایک امریکن سے شادی کر لی۔“

ایکسٹرنل نے آہستہ سے شراب کا گلاس غالیچ پر لٹکا دیا۔ اُس کی  
 انگلیاں کالج کی سطح پر سختی سے جم گئیں۔ کالج اس کی انگلیوں کو زنجی کرتا  
 ہوا ریزہ ریزہ ہو گیا۔

وہ دھبے جوئے لکے سے کہنے لگا: ”یہ غلط ہے، بائبل غلط ہے!“

آرٹسٹ نے میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھا۔

ایکٹر کا چہرہ!..... وہ غالیچے پر دونوں کنٹیاں ٹیکے میری طرف دیکھ رہا

تھا..... اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس کا چہرہ ساجا رہا تھا۔

مئی کے خدو خال ابھر رہے تھے۔

”یہ غلط ہے۔ بالکل غلط ہے“ وہ پھر سچیا، پھر اک دم خاموش ہو گیا۔

دوسرا ایکٹر اُس کے گلاس میں شراب اُنٹیلنے لگا۔ وہ اب بھی خاموش تھا، لیکن پہلا

ایکٹر غالیچے سے لگ کر سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اُس نے غالیچے پر قے کر

دی.... مجھے غالیچے کا رنگ اُڑتا ہوا معلوم ہوا۔ سُرخ سے سپید زرد

جیسے یہ غالیچہ نہ ہو زندگی کا کفن ہو۔

رانی! رانی! رانی!!

صبح میں نے غالیچہ دھلوا یا، اور صاف کروا کے پھر کمرے میں رکھا۔

کہ میری محبوبہ کمرے میں داخل ہوتی، یہ میری سنے شہر کی محبوبہ تھی، یہاں آکر

آرٹسٹ نے پھر عشق کر لیا تھا عشق کرنا کس قدر مشکل ہے لیکن جب عشق

مر جائے، اُس کے بعد عشق کرنا کس قدر آسان ہو جاتا ہے! ہے نا!

مردود ہوتے لکھنوں نہیں ہو، جواب دو! میری محبوبہ کے ہونٹ موٹے



تھے، رخسار بھی موٹے، جسم بھی موٹا، ہنسی بھی موٹی، عقل بھی موٹی، وہ عورت نہ تھی، اک دہرا تہرا غالیچہ تھی، آج اس نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں بنا ڈالی تھیں، اور ان میں جنیپلی کے پھول سجائے تھے۔  
 وہ غالیچے پر آکر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کی بلائیں لے کر کہا: آج تو تم قلو پٹرو کو بھی مات کرتی ہو؟  
 وہ کلہو پترا کیا ہے؟ اس نے پوچھا۔  
 ”مصر کی ملکہ تھی۔“

”میسرہ“

”ہاں مصر! وہ ملک جہاں مرنے کے بعد ابرام تیار ہوتے ہیں۔ اور مردوں کی مسمیاں تیار کی جاتی ہیں۔۔۔۔۔ خدا کرے تمہاری موت بھی قلو پٹرو کی طرح ہو!“

”ہائے کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا ہوا تھا اُسے۔۔۔۔۔!“

”سانپ سے ڈسوا کر مر گئی تھی!“

وہ اک ہلکی سی چیخ مار کر میرے قریب آگئی: ”ڈراتے ہو مجھے۔ اس نے میرا بازو کچھڑ کر کہا۔ پھر وہ ہنسی، اپنی موٹی بھتی ہنسی، جیسے بھینس جگالی کر

رہی ہو..... پھر اُس نے اپنے ہونٹ میرے آگے بڑھا دیے، جیسے کوئی  
فیاض جاٹ کسی اجنبی شہری کو گنا چومنے کو دے دے!

میں نے گنا چومتے جھٹے کہا: ”یہ غالیچہ جیتا ایک بار ہے لیکن مرنا  
بار بار ہے.... آہ.... یہ موت بار بار کیوں آتی ہے.... اب ابھی جائے  
آخری موت!“

”آج یہ تم کیوں بار بار موت کا ذکر کر رہے ہو؟ وہ منمناتی۔  
”کچھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی“ میں نے کہا: ”ہاں یہ تو بتاؤ آج تمہارے  
تازہ لبوں سے، رخساروں سے، آنکھوں سے، بالوں سے، یہ کیسی  
لطیف خوشبو نکل رہی ہے؟“

”کچھ نہیں!“ وہ ہنس کر بولی: ”آج کھوٹے سے کاخو سبوتا رتیل لگایا ہے!“  
میں نے غالیچے کی طرف کلکھیوں سے دیکھا، اس کا رنگ اُٹا آجہا رہا تھا  
بے چارہ ایک بار پھر مر رہا تھا، اُس کی جانتھی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی میں  
گلیہ کر کرے سے باہر نکل گیا۔

سیدھا سٹیشن پہنچ گیا، ارادہ تھا، جی بھر کر بی بیوں کا، نہ صرف  
اپنے گردن کو بلکہ اپنی رُخ کو بھی جلابِ دل لگاتا کہ یہ سارا کوڑا کرکٹ۔

غالیچہ

برجائے، نکل جائے، طبیعت ہلکی ہو جائے۔

سیٹشن پر تیرے پہلے روپ مل گئی۔

”اے؟ تم کہاں؟“

”جونا گڑھ گئی تھی پہاڑ پر۔“

”اور شاعر؟“

وہ کھالس کر کہنے لگی، اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔“

”چھوڑ دیا ہے کیوں؟“

”مجھے تپ دق ہے، جونا گڑھ سینٹی ٹوریم میں گئی تھی نا!“

اس کی نگاہوں میں ہنر رنگ کا سمندر تھا۔ اور اک زرد رُوخیم چہرہ

بھنور میں غوطے کھا رہا تھا۔ پھر وہ چہرہ بھی غائب ہو گیا، اب شاعر کا سٹرا

بُسا اُیشرو لہروں میں تھمسنے لگا، شاعر کا چہرہ سر ہٹا کر کہہ رہا تھا، ”ہوں۔“

میں نے کہا، ”کہاں ہے وہ حوا مزادہ!“

”جھانے دو۔ وہ محزوں انداز میں کہنے لگی۔ اُسے گالی نہ دو۔۔۔۔۔ مجھے

”اُس سے ابھی تک محبت ہے!“

”لیکن۔“

”ہاں“ وہ بولی۔ اس لیکن کے بعد بھی۔ اب میں اپنے گھر جا رہی ہوں، میکے، آرام سے مروں گی۔“

”نہیں، نہیں۔ میں نے سختی سے کہا۔ اب میں تمہیں نہیں جاننے دوں گی۔ زندگی نے تمہیں مجھ سے چھین لیا، اب موت کے دروازے تک ہم دونوں اکٹھے چلیں گے، اور اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا ہے تو شاید؟۔“ وہ ہنسی، وہی اچھالی ہنسی، وہی صندلی چہرہ، وہی دکھائی دینا، تم۔ میں نے اُس کی ہانپ پکڑ کر کہا۔ ”گھر چلو۔۔۔ روپا جیسے جی تم نے مجھے اپنے ساتھ نہ لے رہے۔ اب موت کے چند لمحے تو بخش دو۔“

وہ مسکرائی۔ بولی۔ ”تم نہیں جانتے؟ محبت زندگی میں اور موت میں بھی یکساں سلوک کرتی ہے!“ گاڑی نے سیٹی دی۔

وہ بولی۔ ”مجھے امید نہ تھی تم کبھی ملو گے! افسوس ہے کہ میں یہاں تک نہیں سکتی، ہاں یہ کتاب تمہیں دے سکتی ہوں، لکھے کی تعلیم۔“ گارڈ نے جھنڈی دکھائی۔

وہ اپنے ڈبے کی طرف چل دی، میں اُس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ

سکا میری آنکھیں پھر اس کے پاؤں پر گر گئیں، وہ پاؤں چلتے گئے، چلتے گئے۔

دور جاتے ہوئے بھی گویا قریب آتے گئے، بالکل میرے سینے پر آ گئے، اور میں نے انہیں اٹھا کر اپنے سینے کے اندر چھپا لیا.....  
میں نے نگاہ اٹھائی۔  
گٹاڑی ہچاکی تھی۔

محبوبہ ابھی تک میری راہ دیکھ رہی تھی۔ بولی: "کہاں چلے گئے تھے؟  
میں چپ ہو رہا۔  
"یہ کونسی کتاب ہے؟"  
"الکے کی؟"  
"کیا؟"

"ایک شاعر کی نظمیں ہیں۔"  
"مجھے سناؤ، کیا کہتا ہے یہ؟"  
میں نے کتاب کھولی، پندرہواں صفحہ آنکھوں کے سامنے آیا بہت

سے پڑھنا شروع کیا۔ اسے خدا تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی۔ اب موت تم میری مرضی کے مطابق بخش دے تجھے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوند!“

”پھر موت!“ وہ بولی۔ ”برا شکون ہے۔ اس نے کتاب مجھے ہاتھ سے چھین کر الگ کر دی، اور اپنے لب میری طرف بڑھا دیے۔ غالیچہ اُبل اُٹھا، بالکل آگ تھا۔ شعلوں کا دریا پیپ کا سمندر زیر کا کھوتا ہوا گرم پتھر، میں نے اس سے پوچھا: ”تم صلیب ہو، تم نے آدمی کے بیٹے کو سیجا بنا دیا۔ بتاؤ مجھے کیا بناؤ گے؟“

غالیچہ نے کہا: ”جو تم خود ہی چکے ہو، اک اہرام۔“

جس کے سینے میں میاں دفن ہیں۔

میں نے اپنی محبوبہ سے کہا: ”میرا جی چاہتا ہے۔ اس غالیچے کو جلا کر خاک کر ڈالوں۔“

وہ بولی: ”ہاں! پرانا تو ہو گیا ہے۔“

”لیکن میں نے رک کر افسرہ لیجے میں کہا۔“ ”میرے پاس تو یہی

ایک غالیچہ ہے۔ اور یہی ایک زندگی ہے۔ اسے بدل سکتا ہوں اُسے...!!!“

یہ کہہ کر آرٹسٹ گناہ سننے لگا۔

# ایک اسٹراٹجی کی

یہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۲ء کی دوپہر کا واقعہ ہے میں کاناگا کر اپنے دفتر کی میز پر سرٹیکے اونگھ رہا تھا کہ کمرے میں ایک اسٹراٹجی داخل ہوئی۔ یہ تو ایک ہیروئن اور ایک اسٹراٹجی میں وجہ تفریق کی بہت سی باتیں ہیں، لیکن ایک موٹی سی بات جو مجھے ایسے کندو میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ہیروئن اس طرح مجھے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی جب ہیروئن یا کوئی اہم کردار ادا کرنے والی مشد کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کسی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ تو اس کمرے میں نین چار آدمی اس کی پیشوائی کے لیے ضرور موجود رہتے ہیں، اس کی آمد کی خبر پہلے سے کر دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی کندہ نارتاش

## ایک کسٹرا لڑکی

کاسرینز پر اڑھکتا ہوا نظر آجائے تو اسے شو کے دے کر پہلے ہی سے خبردار کر دیا جاتا ہے۔ ہوشیار باش، مثلاً آرہی ہے۔ اور چونکہ اس دوپہر کو اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ اس لیے یقیناً وہ لڑکی جو گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میسے کمرے میں داخل ہوئی اکسٹرا لڑکی تھی۔

اس لڑکی کا نام زمبیہ تھا۔ وہ منہس کر مجھ سے کہنے لگی کہ گھر والے اسے ”زمب“ ”زمب“ کہہ کر پکارتے ہیں میں نے یہ کہہ کر مال دیا کہ اس طرح کہنا کچھ گھروالوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ بہر حال ”زمب“ نام کی ایک اور لڑکی کو بھی میں جانتا ہوں۔ لیکن اس کی کہانی پھر کبھی لکھوں گا۔ کیونکہ اس کے قلم نامے میں حرفِ سوالیہ بھی آیا ہے۔ اور اس زمب کے افسانے میں حرفِ سوالیہ اگر گزر گیا ہے، یہ حرفِ سوالیہ بھی زندگی میں کمی ڈھنگ سے آتا ہے، کبھی تو یہ محبوب کے لمبے کی طرح شہد آگئیں ہوتا ہے اور کبھی ناکام فتادوں کی طرح تلخ، کبھی اس کی تشکیل سرخ انگاروں کے ہوتی ہے، اور کبھی افسوؤں کے نیلین پانی سے، لیکن ہر زندگی میں ایک بار تو یہ حرفِ سوالیہ ضرور آتا ہے، یہ بڑا دلچسپ مسئلہ ہوتا ہے، زمب یعنی وہ زمب نہیں جس کی کہانی میں اب لکھ رہا ہوں، بلکہ وہ زمب جس



## ایک اسٹراڈلٹی

کی کہانی میں پھر کبھی لکھوں گا۔ ابھی اس مرحلے میں سے گزر رہی ہے اور میں بحیثیت ایک تماشا خانے کے کسی قسم کا مشورہ نہیں دینا چاہتا۔ اس سے صرف توقع کرتا ہوں کہ اگر کبھی یہ سطور اس کی نظر سے گزریں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جائے۔ اور اگر نہ مسکرائے تو اور بھی بہتر ہو گا۔

زبیدہ زکری کی تلاش میں آئی تھی، اور اسٹوڈیو کے مالک نے غالباً مجھے سب سے بے ضرر اور مرخانی مہینج آدمی سمجھ کر اس کام پر تعینات کیا تھا۔ کہ میں اسٹراڈلٹیوں اور اسٹراڈلٹیوں کی شکل و صورت اور ان کی اداکاری کے امکانات کا صحیح جائزہ لوں، یہ اندازہ اس نے میرے گہنے سر دہیز چینک، اور اس بے اعتنائی سے لگایا تھا جس کا مظاہرہ میں اکثر صنعت باز کے سامنے کیا کرتا ہوں۔ اُسے کیا معلوم کہ یہ تو محض اک واقعتی حربے بے وز میری جلد کے نیچے بھی وہی تیز لہر دوڑتا ہے۔ اور احساسات کے مہیلاؤں میں وہی جنسی آگ شعلہ زن ہے اور ٹھنڈی یخ، برقی ننگا ہوں کی بدلیروں میں بجلیوں کے کوندے مستور ہیں، شاید وہ سب کچھ سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اس قدر کمزور ہوں کہ اپنی جھڑی شرافت کے خول کو توڑنے کی سکت بھی مجھ میں نہیں۔ اس لیے میں درحقیقت بے ضرر

## ایک کسٹرائی

ہوں۔ یہ حقیقت بڑی تکلیف دہ ہے، اور داستان بیان کرتے وقت کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تکلیف دہ ہونے کے بجائے یہ میرے لیے اکثر دھجرت بن جاتی ہے اور میں اس جھوٹی شرافت کے سرچشمے سے اپنے لیے کئی بار احساس برتری مستعار لے لیا کرتا ہوں تم نہیں سمجھو گے۔ لیکن وہ زیب — میرا مطلب ہے وہ زیب ضرور کچھ جانے گی جس کے لیے میں یہ کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔

ہاں تو زبیدہ اُس دوپہر کو میرے کمرے میں ملازمت چاہل کھانے کی غرض سے داخل ہوئی۔ زبیدہ چھٹی لڑکی تھی جس سے اُس روز مجھے انٹرویو کرنا پڑا۔ سب سے پہلے جرات کی کئی تھی وہ اپنے دو بھائی بھی ساتھ لائی تھی ایک کا نام بے بی گنگرے تھا، اور دوسرے کا نام جانی لاپو، وہ گجراتی لڑکی تھی۔ پرانی کمان کی طرح ڈھیلی ڈھالی، ناک نقشہ، چال ڈھال، بات شہیت میں ایک غیر معین، ناہمواری ہے، دلی، بے سلیکٹی، ایسا معلوم ہوتا تھا، بطور ابھی ابھی گیلی مٹی سے بنائی گئی ہے، اور اس کے فوراً بعد ہی میرے کمرے میں انٹرویو کے لیے دھکیل دی گئی ہے، میں نے اُسے ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔



## ایک اسٹرا لٹری

تھی چل بھی نہ سکتی تھی اچھی طرح سے۔ جلتے ہوئے چمکٹ سے ٹکرائی۔  
پھر نظروں سے غائب ہو گئی۔ کون کتا ہے غائب ہو گئی۔ ابھی تک میرا  
نگاہوں میں محفوظ ہے۔ اس کمرے کی میز پر اس فرش پر اس چوکھٹ پر  
اس دروازے کے شیشوں پر اس گیلی مٹی کے نشان ہیں۔ دیکھنے والا دیکھ  
سکتا ہے۔

دوسری لڑکی بدھوار پیٹ پڑنا سے آئی تھی۔ پڑنا سے بیسی آئی تھی۔ نگاہی  
نگ کی جارجٹ کی ساڑھی اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی، اور اس کے اندر  
سے اس کا جسم اک خشک تنے کی طرح نظر آ رہا تھا، اس کی نگاہیں ویران  
تھیں، اس کے لب ویران تھے اور اس کا سینہ ویران تھا، وہ اک ٹسے ہوئے  
شخص کی طرح، اگر مجھے سامنے کر سی پر بیٹھ گئی۔ اس طرح بیٹھ گئی گویا کہ  
رہی ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے ملازمت نہیں دو گے۔ میں جانتی ہوں  
مجھ میں رس، شعریت نہیں، نساہت نہیں، پھر بھی میں تمہارے پاس  
آئی ہوں۔ کیا اس بے حیائی، ٹوٹائی، کوئی امید بر نہ آئی یا کی بھی داد نہ  
دو گے۔

میں نے دل میں کہا ”مطلق نہیں“ اور اس سے پوچھا ”تمہارا نام؟“

## ایک اکسٹرا لڑکی

”کوشیا“

”تم بدھوا رہی ہو پنا سے آئی ہو“

”ہاں ہوں“

”ہاں ہو؟“ میں نے کہا۔ ”تم امرتسر کی رہنے والی معلوم ہوتی ہو؟“

”خوب پہچانتی ہوں۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔ اور اس کے سیاہی مائل

نرد دانت جڑوں میں اکھڑی ہوئی جڑوں کے سروں کی طرح دکھائی دینے لگے۔

”پہلے کسی تصویر میں کام کیا ہے؟“

”ہاں ہوا حکم دیکھ، تے جادوگر باج بہا دور چٹ پٹ منگنی، میں

گاتی بھی ہوں، بدھوا رہی ہو میں اپنا کوٹھا ہے۔ کبھی آؤں؟“

میں نے پوچھا۔ ”تم امرتسر سے پونا کیسے آگئیں؟“

”رزق!“ اس نے آہستہ سے کہا۔ بے ڈلی سے کہا۔ بے سبب بانی

بے نور لہجے میں کہا۔ اُس کی نگاہوں میں، اُس کے جسم میں، اس کی روح میں

تاریکی ہی تاریکی تھی اور اسے دیکھ کر ایک کراہت آمیز نفرت کا احساس

میرے دل میں بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ شاید وہ عورت نہ تھی، تاریک گندے

گھسے بانی میں پیدا ہونے والی جو تک تھی جو میری میز پر دھری تھی۔ اور آہستہ آہستہ

## ایک انکسٹراڈک

میری طرف ریٹنگ رہی تھی۔

”جاؤ، جاؤ... میں نے چلا کر کہا۔

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے معافی مانگتے

ہوئے کہا۔ ”در اہل بات یہ ہے کہ ایسی فلم کے شروع ہونے میں دو ماہ باقی ہیں۔

ہمیں جیتنا آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی اور بھی بہت سی لڑکیاں...“

وہ میری بات کاٹ کر بولی، میری چھوٹی بہن گوشتی بھی مجھے

ساتھ آئی ہے...“ او گوشتی ادھر آؤ

بڑی جونک، چھوٹی جونک! اس سے چھوٹی جونک....

”ماں آپ کو اور آپ کی بہن کو بھی ضرور بلاؤں گا۔ فی الحال تو۔

اچھا ملتے“

”یہ میرے فوٹو ہیں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے اپنی گلابی ساڑھی کا پتہ دے

کہتے ہوئے کہا۔ ”جو پرنسپل کا میڈل تو ہمارے کوشٹے ضرور آنا“

وہ دونوں پہلی ٹیمیں، بڑی جونک چھوٹی جونک.....!

تیسری لڑکی۔ ”اٹھی تھو“ مراٹھی لڑکیوں کے بدن میں بالعموم ایک

دکھش سناؤ ہو تب لے اور انکھوں میں اک بے بس ہر فی کی سی مغروریت ہوتی ہے۔ جسے

ایک اکثریتی

مرد بالعموم بہت پسند کرتے ہیں، لیکن یہ لڑکی بے بس ضرور نظر آتی تھی۔۔۔  
..... لیکن ہر فی نہیں نگاہوں میں تناؤ ضرور تھا لیکن ججہم  
میں اس حقیقت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ عجیب بے ڈھنگی سی۔ گٹر بکڑ یا  
چنچ کی سی چال پلٹی ہوئی اندرائی، اس کے ساتھ اس کا خاوند تھا۔ جو  
کمرے میں داخل ہوتے ہی دانت نکال کر مسکرانے لگا۔ اور جب تک  
کمرے میں رہا۔ اسی طرح مسکراتا رہا۔ خدا جانے یہ کمرے کی فضا کا اثر تھا  
یا میری صورت کا یا اُس خوش آنسو تصویر کا جو اُس کی بیوی کے منہ بن  
جانے کی صورت میں اُس کے مستقبل کی ہوتی۔ شاید اُس کی مسکراہٹ  
اُس حرف سوالیہ کا جواب بھی جابجی جابج اس بد نصیب جوڑے کے مقدر میں لکھا  
جا رہا تھا۔ اکثر اوقات آدمی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ حرف سوالیہ اُس کے  
سامنے ہے اور اُس سے زندگی کا، اُس کی اہمیت کا، اُس کے تاثر کا،  
اس کے بنیادی اخلاق کا جواب طلب کر رہا ہے، وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا  
اور یونہی احتفانہ طریق پر مسکراتے جاتا ہے، یہ آدمی یہی کر رہا تھا۔ بیس سال  
بعد جب یہ گنجابو جائے گا۔ اور اس کی آنکھوں پر دبیز عینک چڑھی ہوگی۔  
میری طرح رٹے گا، مسکرانے دو ابھی اسے۔۔۔۔

## ایک اکسٹرا راز کی

”یہ میرا ہی ہے“ وہ مسکرا کر بولا ”نوکری کرنے ہوتا“

”ہندی یا اردو بھانتی ہے؟“

”ہو۔ پھارچا نگلا.... (بہت اچھا)

میں نے کہا ”اچھا تو لکھو.... اسے میں اس لکھو ہی کے گھر کیوں...“

”نہیں.... نہیں۔ لکھنے کو نہیں مانگتا۔ میرا ہیوی زبانی یاد کرتا۔ تم اس کو

بتاتا یہ اکسٹرنے.... پھارچا نگلا“

میں نے کہا ”اچھا تو کمر شب چراغ“

”شب چراغ“

”شب چراغ نہیں۔ شب چراغ“

”شب چراغ۔۔۔ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے پوچھا ”یہ ہنستی کیوں ہے؟“

وہ اپنی ہنسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا ”ایہہ.... ہمارے بولی

میں اس گرجالی بولتا۔ بڑا گالی“

”پھارچا نگلا!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ کہو.... ”شب چراغ“

”نہیں۔۔۔ نہیں....“ وہ اب شرمائی۔ شرماتے وقت اتنی ہیروئن



## ایک اکثرالک

اور احمق معلوم ہونے لگی وہ .....

”پہلے کسی تصویر میں کام کیا؟“ میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں۔ ہمارا بیوی کوھر کام نہیں مانگتا۔ ام شریچہ رگ لے

اڑے ٹکڑے ام بولا۔ اس کمپنی کا لوگ بوست آجاء اس کو مشکل سے اچی

کرتا۔ میرا بیوی بوتا۔ تم اٹھے ساتھ ہوتا تو ہم کام کرتا ہوا ام بولا۔ پچا چا نکلا

ام جی تھامے سنگ کام کرتا۔ ام اس کے سنگ اتی پریم کرتا۔

”پچا چا نکلا!“ میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”متھارا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ آخر میں میں نے اس جوڑے سے

کہا۔ دکا باوی لیں۔ پورا نامندر۔ بمبئی ۹ میں ہے نا۔ بہت جلدی

تھیں بلانے کی کوشش کروں گا۔“

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہا میں نے اپنا جواب ہلایا۔ وہ پھر بھی

مسکراتا رہا میں نے انھیں رخصت کرنے کے لیے ہات بڑھایا۔ اس نے

ہات جوڑ دیے اور مسکراتا رہا۔ اس کے کوٹ کا کاترین جگہ سے پٹا ہوا تھا

اُس لڑکی کی دھوٹی گوگھر کی ڈھلی ہوئی تھی۔ لیکن سخت بوسیدہ تھی۔ اٹھتے وقت

مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سچ مچ بے بس ہرنی

## ایک اسکڑا رہی

تھی۔ اُس کی نگاہیں زمین پر مڑ گئیں اور اس کا خاوند مسکراتا رہا۔ واپس  
 چلتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے برابر مسکراتا رہا۔ اور جب وہ میرے  
 کمرے کے باہر چلا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہنسی نہ تھی، یہ رون تھا۔ اُس  
 کی شرافت بھی میری طرح جھوٹی تھی اور جگہ جگہ سے کھٹکی ہوئی تھی۔ اور وہ  
 اس میں تبسم کا پیوند لگا کر اپنی غربت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا  
 تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنی بیوی کو بیچنے آیا تھا، اور مسکراتا تھا۔  
 اور اُس کی مسکراہٹ میں انسانیت کا خون تھا، یہ باتیں میں اب ہم سے بیا  
 کر رہا ہوں۔ ورنہ اس وقت میں نے اُس سے صرف یہ کہا تھا۔ میں تمہیں ضرور  
 جانے کی کوشش کروں گا، یہ جھوٹ ضرور تھا کیونکہ وہ دونوں خاوند میری  
 کسی ہندوستانی فلم میں کام کرنے کے لیے قطعی نامزد ہوں تھے۔ لیکن یہ ایک معمولی  
 سا جھوٹ تھا۔ اتنا معمولی جتنا اس آدمی کا تبسم، ایک سیدھا سادا عام جھوٹ  
 ایک جھوٹے آدمی نے دوسرے جھوٹے آدمی سے جھوٹ بولا۔ بس اور کیا۔  
 پانچویں لڑکی نہ تھی، ادھیڑ عمر کی عورت تھی، تین بچوں کی ماں، دوڑ کیا  
 ایک لڑکا۔ بیوہ اور فرہ اندام اور گلاب جاری، خوش رنگ، آتے ہی پھسکا  
 مار کر کسی پر بیٹھ گئی، پھر بیڑی نکال کر سگانے لگی۔ بولی۔ کپنی نے کلبے کو



## ایک کٹر لڑکی

”آٹھ دس دن کا کام ہے“

”باس؟“

”بس!“

”اچھا تو کروں گی۔ مگر بابا بڑے کتنے دو گئے“

”پچھتر روپیہ باہوار“

”باس؟“

”بس!“

”یہ تو بہت کم ہے بابا۔ میرے بچے ہیں۔ دو لڑکیاں۔ ان کا بیاہ

مجھے کرنا ہے۔ کچھ تو سوچا دو۔“

ملیح اترنے لگا۔ اور جب وہ چلنے لگی تو بالکل ہی اتر چکا تھا۔

چھٹی لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ جسے گھر والے زیب کہہ کر پکارتے تھے۔

خیر یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، وہ کنواری تھی، کم از کم اُس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔

زبیدہ کا جسم جوان تھا، اُس کی آنکھیں جوان تھیں، اُس کے ہونٹ جوان

تھے، اس کی مسکراہٹ جوان تھی، اُس کا ماتھا گھٹا ہوا تھا، اس کی ناک میٹھی

## ایک اکسٹرانڈی

ہوئی تھی، اس کا رنگ کالا تھا، وہ ایک ایسی لڑکی تھی، جو بد صورت ہوتے  
 مومے بھی بد صورت نہ تھی اور خوبصورت سمجھے جاتے بھی خوبصورت نہ تھی،  
 اس کے جسم کے خطوط میں، اور اس کے آہنگ میں، اور اس کے نغصے  
 میں شمال اور جنوب کے قطبوں کی آمیزش تھی، آریائی خون در اوڑجلہ میں لہریں  
 لے رہا تھا، اور در اوڑی جدت آریائی برف کو گھلا کر اسے ہانی کی طرح  
 پگھلا رہی تھی، اس وجہ سے تو زبیدہ کے جسم کا اور اس کی روح کا  
 صحیح تجربہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اک مسلسل تجربہ تھی، جسے دو نسلیں،  
 دو تہذیبیں، دو زمانے، ایک سانچے میں کھول رہے تھے، اسی لیے تو وہ  
 خوبصورت تھی نہ بد صورت، جوان تھی نہ بڑھیا، کالی تھی نہ گوری، آریائی تھی  
 نہ در اوڑی، کبھی تو اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن معلوم ہونے لگتیں  
 اور وہ خوبصورت معلوم ہونے لگتی، دوسرے لمحے میں اس کی آنکھیں چھوٹی  
 اور اس کا ماتھا گھٹا ہوا معلوم ہوتا۔ کبھی تو اس کی جلد میں آریائی  
 اُجلا پن نظر آتا، دوسرے لمحے میں کالی ناگن کی سیاہ لطافت اس  
 کی جلد میں نمودار آتی، اور میٹھی ہوئی ناک کے نیچے خوفناک پھنوں کی طرح  
 پھڑکنے لگتی۔

ایک لکٹر ارٹ کی

”زبیدہ۔ کہاں کی رہنے والی ہو؟“

”بھئی کی“

”باپ کیا کام کرتا ہے؟“

”ایک سوڈا وارٹ کی دکان ہے اس کی، اور میری ماں ایک پارسی

کے ہاں ملازم ہے۔“

”اور انہیں تمہارے — میرا مطلب ہے — اگر تم —

نظم میں کام کرو تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”مطلق نہیں صاحب!“

”تم اردو بہت اچھا جانتی ہو۔“

”شکریہ۔ مجھے غزلوں کا بہت شوق ہے۔ میرا باپ بڑا عالم

فاضل ہے میرے پاس مینائی، جگر، خائب، آغ سب کے دیوان موجود ہیں۔“

”جو ش کا کلام دیکھا ہے۔“

”نہیں۔“

”کرشن چندر کے افسانے پڑھے ہیں۔“

”نہیں، مجھے افسانے کئی دیکھی نہیں۔ مجھے بس غزلوں کا شوق ہے،

ایک اکثر اڑکی

داغ آکا کیا کہتا ہے۔ اور جگر! واہ واہ . . . . .

”تم لوگری کیوں کرنا چاہتی ہو؟“

”مجھے فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔“

”فلم میں کام کرنا جان جو کھوں کا کام ہے۔“

”واہ۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ میک آپ کیا اور کیرے کے سامنے

آگئے وہ اس میں کیا مشکل ہے۔“

”کبھی کام کیا ہے۔“

”نہیں۔ مگر شوق ہے مجھے غزلوں کا بڑا شوق ہے آغے لیں کتے میں؟“

”نہیں میں غزلیں نہیں کہتا۔ سننا ہوں۔ سنناؤ گی؟“

”واہ۔ میں غزلیں کیوں سنناؤں گی بھلا میں شعر تو نہیں کہتی دوسروں

کے کہے جوتے پڑھتی ہوں۔ مجھے تم کوئی پارٹ دونا۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”جانی واکر۔“

”جانی واکر اچھی چھی چھی جانی واکر بڑا برا نام ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ یہ ایک شراب کا نام ہے۔ اچھے آدمی شراب نہیں

ایک اسٹراٹل

پیتے۔ مجھے جگر کی غزلیں بہت پسند ہیں۔

”جگر شراب نہیں پیتا“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے؟“

”مجھے حساب نے بتایا تھا میں ایک روز مہتاب سے ملنے گئی تھی بھاری

اچھی طرح ملی۔ چائے پلائی، اتنی بڑی ایکٹرس ہے وہ، برغزور۔۔۔ جی جی جی

— نہ جانے بڑی بڑی فلم ایکٹرسوں کو غرور کس بات کا ہوتا ہے۔ کیوں

جی؟ اور میں نے دیکھا رانی کو ٹیلی فون کیا اُس نے جواب نہیں دیا۔ کیوں جی؟

یہ کیا بات ہے۔ واہ۔۔۔“

میں اُس کی ساڑھی کی طرف دیکھنے لگا۔ دھوبی کے ہاں دھلی ہوئی

تھی۔ سفید وائل کی ساڑھی جس پر طاؤسی نقش و نگار کا بارڈر تھا۔

میں نے کہا: ”بارڈر اچھا ہے۔“

وہ بولی: ”شکریہ۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔“

میں نے پوچھا: ”تمہیں کیسے معلوم ہے۔ جگو نے بتایا تھا کہ مہتاب

نے کہہ دیا رانی نے۔“



ایک اکثر اڑکی

وہ بولی ”چھی چھی چھی۔ ایسی باتیں کرتے تھے آپ کو شرم نہیں آتی یہ کہہ کر اُس نے اپنا بات میرے ہات پر رکھ دیا۔“ لائیے میں آپ کا ہات دکھیوں۔“ میں نے اپنا ہات اُس کے ہات میں ڈال دیا۔ دونوں ہاتھوں میں بہت سی باتیں ہوئیں، محبت کی باتیں، وصال کی باتیں، جسم کی لذت کی باتیں ہمیشہ زندہ اور جوان ہنس کی باتیں، سب جھوٹی باتیں، میں بھی سمجھتا تھا، وہ بھی سمجھتی تھی، آخر اکٹرا کر کہنے لگی۔ ”مجھے نوکری چاہیے۔“

میں نے کہا ”میں نے تمہارا ہاتھ نوٹ کر لیا ہے اور۔“

وہ بولی ”مجھے کل تک جواب دو۔“

اس کے بعد وہ دوسرے دن آئی۔ تیسرے دن وہ آئی۔ چوتھے دن وہ آئی، پندرہویں دن وہ آئی۔ ہر بار اس کے ہات میں ایک نئی کتاب ہوتی، کسی پرانے شاعر کا کلام، طبع نوکشور، لکھنؤ، پرانی کتابیں جن سے سونڈھی سونڈھی خوشبو آتی تھی، پرانے کاغذوں کی خوشبو، پرانے زمانوں کی پرانی جوانیوں کی، پرانے آنسوؤں کی خوشبو، اور ہر بار اُس کے بدن پر وہی اسی ہوتی، دھوبی کے ہات سے دھلی ہوئی اور وہی طاؤسی بارٹور، اور وہی غولیں، بار بار پتھر کر مجھے سناتی تھی وہ، اور ہر روز نوکری کے لیے التجا

## ایک اکسٹرا لڑکی

کرتی یونی، باتوں باتوں میں سرسری طور پر، ایک دفعہ کہہ دیتی، اور پھر وہ ان کے ورق اُلٹ کر مجھے سنانے لگتی، جیسے نوکری سے زیادہ ان شاعروں سے عشق ہے۔

ایک دن میں نے کہنی کے مالک سے کہا: ایک اکسٹرا لڑکی آتی ہے نام ہے زبیدہ، تلفظ اچھا ہے۔ گونا گوں بولتی ہے، مگر سہل جائے گی۔  
”شکل و صورت کیسی ہے۔“

”بس یونی جیسے اکسٹرا لڑکیوں کی ہوتی ہے، مگر وہیں معلوم ہوتی ہے اس کا باپ بڑا عالم فاضل“ ہے اس کی ماں اک پارس کے ادا ملازم ہے۔  
”کون ہے وہ؟“

میں نے کہا: ”طوائف تو نہیں معلوم ہوتی۔ نیم طوائف شاید۔“  
”جہانے دو۔“

میرے انکار کرنے کے بعد بھی وہ آتی رہی کسی نے اُسے بتایا کہ سعید اُسے نوکر کر سکتا ہے۔ وہ سعید کے پاس گئی، کسی نے اُسے بتایا کہ جمیل سے اس کا کام ہو سکتا ہے، وہ جمیل کے پاس گئی، کسی نے بتایا کہ لال اس کا کام کر دے گا، وہ لال کے پاس گئی۔ اور پھر پھر کر میرے پاس آئی۔ اب

## ایک اکثر اڑکی

وہ سارے سٹوڈیو میں بدنام ہو چکی تھی، کیونکہ وہ نوکر ہونا چاہتی تھی، اور اسے نوکر چاہنے والے کا ڈسنگ نہ آتا تھا۔ وہ اس بے حیائی کے انداز میں کہہ رہی تھی مجھے ے لو۔۔۔ مجھے ے لو۔۔۔ کہ کوئی اُسے لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی تیوری چڑھالی۔ میں اس کی مسلسل آمد و رفت سے عاجز آچکا تھا۔ اور اُس سے چٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”زیب!“

”جی!“

”تم گھر جاؤ اور یہاں کبھی نہ آؤ۔“

”بہت اچھا!“

”جب تمہاری ضرورت ہوگی تمہیں بلا دیا جائے گا۔“

”بہت اچھا!“

”زیب!“

”جی!“

”تمہارا اس طرح خوشامد کرنا مجھے.....“

میرا فقرہ ناتمام رہ گیا۔ کیونکہ وہ رو رہی تھی۔

## ایک اکڑا لڑکی

وہ روتی رہی اور میں میز پر بیٹھا ہوا اپنی انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا۔  
جب وہ چپ ہو گئی تو مسکرا کر کہنے لگی: "یہ شعر آپ کو پسند ہے۔"

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی  
کیوں تیسرا رنگذرا یاد آیا؟

میں نے کہا: "غالب کا شعر ہے!"  
وہ بولی: "اور مجھے یہ شعر بھی بہت پسند ہے۔"

ہم نے بھی وضع غم بدل ڈالی  
جب سے وہ طرزِ التفات گئی؟

میں نے کہا: "جگر کا شعر ہے!"  
وہ بولی: "میں جانتی ہوں۔ خدا حافظ!"  
"خدا حافظ!"

زبیدہ چلی گئی۔ اس نے اپنی وضع غم بدل ڈالی، اب وہ ایک فلمی  
ولالہ بادامی کے پاس ہے، بادامی اسے ایک بہترین فلم ایکٹرس بننے کے  
سارے لوازم ہم پہنچا رہا ہے، اب تک تین چار ڈراموں کو فلمی ستارے بنا چکا ہے۔

## ایک اکسٹرا رول

بادامی ہر سال ایک لاکھ روپہ انکم ٹیکس ادا کرتا ہے، اس کام ہے نئی لڑکیوں کو فلم ایکٹرس بنانا اور پھر انہیں بچانا۔ وہ کتا ہے یہ بڑی اچھی تجارت ہے، ملک میں یہ تجارت اب پانچویں نمبر پر ہے، بادامی نے زمبیدہ کو زندگی کے نازک ترین مرحلے سے بخیر و عافیت گزر جانے کا موقع دیا۔ وہ اس کے لیے سکر گزار ہے، اس سال زمبیدہ بادامی کے ساتھ سندھ اور پنجاب میں ایکسٹراچ پارٹی میں دوے پر جا رہی ہے، پچھلے سال بادامی نے اسی دوے میں تین لاکھ روپہ لکھا تھا۔ اب زمبیدہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے۔

زंबیدہ گئے سال فلم سٹار بن جائے گی۔ پھر وہ اپنی آمدنی کا تیس فیصدی بادامی کی نذر کیا کرے گی، کالج کے لڑکے اس کے گھٹے ہوئے ہاتھ دیکھیں، ہوائی ناک اور گھٹنے اندازہ تکلم پر قریب ہوا کریں گے، اور اس کی تصویریں اپنے البم میں سجائیں گے اور چاندنی راتوں میں آہیں بھریں گے۔ اور جس کمپنی کے مالک نے اسے اپنے ہاں بچتر روپے کی نوکری دینے سے انکار کر دیا تھا وہ اب اُسے دس ہزار روپے دے کر اپنی نئی تصویریں کام کرنے کی دعوت دے گا۔

اور اخباروں میں زمبیدہ کی تصویریں چھپیں گی، اور لوگ اُسے گالیاں دیں گے اور لوگ اسے ہوجائی، بے حیائی، سنگ ناسیت کے حوصلہ افزا خطابات سے

## ایک اسٹراٹجی

نوائے ہیں گئے۔

یہ سب کچھ ہوگا اور بہت کچھ ہوگا اور خوب ہوگا، اور محض اس لیے ہوگا کہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۲ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے ایک عورت کو مار ڈالا تھا اور ایک طوائف کو جنم دیا گیا تھا۔ گیارہ دسمبر ۱۹۴۲ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے سوچ کو ڈوب جانے دیا تھا اور تاریکی کو بچا دیا تھا، گیارہ دسمبر ۱۹۴۲ء کی دوپہر کو میرے اور تمہارے سامنے ایک حرفِ سوال آیا تھا۔ اور اس کے جواب میں میں نے اور تم نے چھ لڑکیوں کے چہروں پر کچھڑ بھڑک دی تھی۔

کیونکہ زبیدہ ایک لڑکی نہ تھی، وہ چھ لڑکیاں تھیں، چھ نہیں بلکہ سات، کیونکہ ان باتوں میں وہ زبیدہ یعنی وہ زبید بھی شامل ہے جس کا اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔

## پچانسی کے سائے میں

زندگی کے آخری لمحے کیوں بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ محض جینا ہی کافی ہے۔ محض جینا ہی خوبصورتی ہے۔..... مجھے فیروز ڈاکو کے آخری لمحے یاد آتے ہیں۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا، اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دوست کے ہاں رام گڑھ جا رہا تھا۔ تھوڑا کلاس کے ڈبے میں بہت بھیڑ تھی۔ بڑی شکل سے مجھے کھڑے ہونے کی جگہ ملی، لمبا سفر تھا کئی گھنٹے اسی طرح کھڑے کھڑے گزر گئے، مجھے قریب کی بیچ پر دو ننھی ننھی درگیاں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا بھائی جس کی عمر بشل آٹھ نو سال کی ہوگی ان سے پرے ان کی ماں بیٹھی تھی، اس سے پرے پھر دو لڑکے بیٹھے تھے

ان کے کپڑے صاف تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی ٹہلی کی ٹریاں، ان کے سائے  
 ان کی ماں بھیٹتی تھی، ادھیڑ عمر کی لالائیں، جس نے ایک پیلے رنگ کی ریشمی  
 دھرتی پہن رکھی تھی۔ اس کا گول چہرہ متین اور غمگین نظر آتا تھا۔ دونوں لڑکے  
 سمٹ کر الگ بیٹھے تھے، اور کبھی کبھی ان دونوں ننھی ننھی لڑکیوں کی ماں کو  
 دیکھ لیتے، ان کے چہروں پر غم و غصہ اور خوف کے جذبات ہرید ہوجاتے  
 اور پھر وہ اپنا چہرہ پرے کر لیتے اور اپنی ماں کا آئینل بکڑ لیتے ننھی لڑکیوں  
 کی ماں کا چہرہ فاق تھا۔ اور بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے، ادا  
 وہ انہیں کالے رنگ کے کھدر کے ڈپٹے سے پونچھ لیتی اور پھر کھڑکی  
 سے باہر دیکھنے لگتی، اس کا لڑکا اپنی ننھی بہنوں کو بیٹھے لڑسوا اور کھٹے کچا  
 اور گندیریاں راستے کے مختلف اسٹیشنوں سے خرید کر کھلاتا تھا اور  
 لالائیں کے لڑکے اسے گھور کر دیکھتے اور پھر اپنی ماں سے کسی حسد کی  
 فرمائش کرتے اور پھر لالائیں آہستہ سے ٹھیک کر سیدٹ کے نیچے سے  
 ایک ٹوکری کا ڈھکنا الگ کر کے سیدٹ سنگترے یا کیلے نکال کر اپنے  
 بیٹوں کو دیتی اور وہ اک ناکھانہ انداز سے ان دو لڑکیوں کے بھائی  
 کی طرف دیکھتے اور منے سے پھل کھانے میں اور اسے دکھادکھا کر کھانے میں



مصرف ہر جانے۔

ابھی رام گڑھ بہت دور تھا۔ اور میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے قریب کی بچہ پڑیٹھی ہوئی ننھی لڑکی سے التفات ظاہر کیا۔ اُسے ایک دو اسٹیشنوں سے کھانے کے لیے چیزیں بھی خرید کر پیش کیں بڑی پیاری ننھی سی لڑکی تھی۔ وہ بہت جلد میری گود میں آگئی اور میں آرام سے اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس نے میری ناک سے کھیلنے ہوئے کہا: ”تم کدہ تل جالہ ہے ہوا“  
میں نے کہا: ”میں رام گڑھ جارہا ہوں۔“

ننھی نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا: ”اماں ایہ ام گڑھ جارہا ہے۔“  
ننھی کی ماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب بیٹھی ہوئی لالائش اور اس کے دونوں لڑکوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور پھر کسی نے مجھ میں دلچسپی لینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف میری گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہی مجھے حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ حیرت اور خوشی، میں اس کا ساتھ تھا۔ ہم دونوں رام گڑھ جا رہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا: ”تھائے ابا کا کیا نام ہے؟“

پھانسی کے سامنے میں

وہ بولی ”فیروز!“

میں نے پوچھا ”تھایے آ بارام گڑھ میں ہیں؟“

وہ بولی ”ہاں میرے آباویل میں ہیں۔“

”ویل میں؟“ میں نے پھر پوچھا۔ اس کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اب دو چار اور لوگ بھی ہماری گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

”ہاں۔ رام گڑھ ویل میں؛ کل اُن کو پھانسی ہوگی!“ لڑکی نے۔

نہایت اطمینان سے گنڈیری چوتے ہوئے جواب دیا۔

”جیل؟ پھانسی؟“

یہ ایک جیسے سارے ڈبے میں سناٹا چھا گیا میں نے لڑکی کی اماں

کی طرف دیکھا لیکن اس نے اپنا چہرہ اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا تھا

اور سسکیاں مے رہی تھی، اس ڈبے کی خاموشی میں وہی سسکیاں بھیلی

جا رہی تھیں۔ لالائش نے اپنے دونوں بچوں کو اپنی جھاتی سے چٹا لیا۔

سب لوگ خوفزدہ سے ہو گئے تھے، جیسے اس چلتی گاڑی میں کسی نے

پھانسی کا تختہ اُن کے سامنے کھڑا کر دیا تھا اور اپنی گردن اسی رسی

میں دیکھ رہے تھے۔

## پھانسی کے سائے میں

”اماں۔ اماں پھانسی ہو گئی نا!“ لڑکی نے بڑے چاٹو سے اپنی اماں سے پوچھا۔  
 اماں نے فوراً اُسے میری گود سے چھین لیا اور زور سے ایک ٹھکانہ پر رسید  
 کیا اور پھر اسے اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا۔ لڑکی بہت دیر تک اس کالے  
 دوپٹے میں روتی رہی، لالاشن اور اس کے بیٹے پر بے سرک گئے، فرش پر  
 دو کسان بیٹھے تھے وہ بھی رام رام کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دور  
 ڈبے کے دوسرے کنارے پر جا کھڑے ہوئے اس عورت اور اس کی  
 دو لڑکیوں اور اس کے لڑکے کے ارد گرد گاڑی کے مسافروں نے  
 ایک نظر نہ آنے والی چار دیواری کھڑی کر دی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی باتوں  
 میں مشغول ہو گئے۔ صرف اُس چار دیواری کے اندر فیروز اور اس کی بیوی  
 اور اس کے بچے اکیلے رہ گئے تھے۔ اور ایک اجنبی ایک طرف دروازے  
 کی دہلیز پر کھڑا تھا اور گاڑی چل رہی تھی۔

اس رات رام گڑھ سے دس میل باہر تیسے دوست نے ایک دعوت  
 کا انتظام کیا تھا۔ چاندنی رات تھی لیکن چاند آدھے سے بھی کم تھا۔ اس لیے  
 چاندنی میں سیاہی اور سیاہی میں چاندنی گھٹی ہوئی تھی، ایسی رات عجیب اسرار  
 ہوتی ہے، زندگی کسی نامعلوم راستے پر دوڑنا چاہتی ہے اور اپنے عزیز ترین

پھانسی کے ساتھ میں

دوستوں کے چہرے بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں، اس محفلِ رقص و سرود میں مجھ  
بھی عجب تھا۔ عورتیں بھی اس میں کی معلوم نہ ہوتی تھیں، یہ سنہی بھی فطری  
نہ تھی، نجانے غم کا ہلکا سا غبار مجھے فضا میں پیرتا ہوا کیوں معلوم ہوتا تھا۔

میرے دوست نے پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہو؟“

”تھکا ہوا ہوں شاید؟“

”اس لڑکی کا رقص تمہیں پسند نہیں؟“

”مجھے غیند آرہی ہے۔“

میرا خیال ہے، میں وہیں اُسی گاؤں کیجئے سے سہارا لگائے سو گیا۔  
سوتے وقت صرف اتنا یاد ہے کہ زبان پر شراب کا ہلکا سا تلخ ذائقہ  
باقی تھا۔ لڑکی نلچ رہی تھی۔ گھنگھروں کی صدا میں اس کی جوان آواز گچھل  
گچھل کر کہہ رہی تھی۔

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا

میرے دوست نے مجھے تھنجوڑ کر جگایا۔ موڑ جاتی جا رہی تھی۔ غائب  
محفلِ رقص و سرود ختم ہو چکی تھی، اور ہم واپس ام گڑھ جا رہے تھے۔ فضا  
میں ایک اُجلا پن آرہا تھا۔ اور بہت سے تاروں کے رنگ ماند پڑ گئے

بھانسی کے ساتھ میں

تھے، لیکن دو ایک تاروں کے رنگ نکھر رہے تھے، ایک ایک ایک تار بہت سی روشنی اور حسین نظر آنے لگا۔ دو رکبیں مرغ بوللا۔ اور پھر گھڑیا نے پاخانہ بجا دیا۔

میرے دوست نے کہا: ”مجھے کیا معلوم تھا تم اتنے تھکے مانگے رام گڑھ پہنچ گئے، میں نے یہ دھوت تمہاری خاطر منعقد کی تھی اور تم سوتے رہے!“

میں نے جانتے سے کہا: ”بھئی معاف کرنا۔ میرے پاس پیسے بالکل نہیں تھے۔ کجنت کبھی نہیں ہوتے۔ تھرو میں آیا۔ اب تم ہی بتاؤ۔۔۔۔۔“

”تھرو میں؟ لا حول ولا یجی ریس اندھا دھند نہ کھیلا کرو۔“

”کون چند ریس کھیلتا ہے، وہ قریبوں سمجھ کر۔۔۔ اچھا تو یہ بتاؤ

کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”جیل جانے میں!“

”جیل خانے میں؟“

”ہاں۔ تمہیں ایک عجیب تماشہ دکلاؤں گے۔ کبھی بھانسی دیکھی ہے تم نے؟“

## پھانسی کے سائے میں

ٹن !

گھڑیال کی آخری گونج میرے خون کی مدھم روانی میں مل گئی اور پھر اس نے میرے خون کے ذرے ذرے کو چمکا دیا، ٹن ٹن ٹن، میرے خون کا ہر ذرہ اس صدا سے گونجنے لگا، اور روانی بڑھتی گئی، اور مجھے اپنا گلا گھٹا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن خون خود بول رہا تھا۔ اس نے مجھے بولنے نہ دیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنا حلقوم سہلانے لگا۔

”شو فر تمہیں معلوم ہے۔ پھانسی کس وقت دی جائے گی۔“

”ساڑھے پانچ بجے حضور۔“

”رگاکڑی تیز چلاؤ۔“

ساڑھے پانچ میں چند منٹ باقی تھے۔ جب ہم جیل خانے کے پھانسی کے اندر داخل ہوئے اور کار کو گھما کر اس طرف لے گئے، جہاں پھانسی کھڑی تھی، یہاں جیل کے ملازمین اور ڈاکٹر، اور چند افسر لوگ جمع تھے، ایک چھوٹے سے میدان میں پھانسی کھڑی تھی۔ دو لمبے لمبے سیاہ کھیمے ایک اندھے کنویں کے دونوں طرف کھڑے تھے، اور اس اندھے کنویں کے اوپر پکڑی کا ایک تختہ بچھا تھا، اس پر بھی سیاہ رنگ

## پھانسی کے سائے میں

کیا ہوا تھا، اور دونوں کھمبوں کے درمیان جو دو لوہے کے تار تھے ان کا رنگ بھی سیاہ تھا اور ان دونوں میں ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ نئے ونوں تار ایک ڈیسے کے متوازی دونوں کھمبوں کے بیچوں بیچ چلے جاتے تھے، میدان کے چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں جن کے اوپر کانچی کے تیز ٹکڑے لگے تھے اور ان سے پرے شمال مشرق میں پہاڑوں کی چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آتی تھیں۔ آسمان اب ابراؤد ہو گیا تھا۔

ہم بھی ڈاکٹر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، وزیر صاحب کے لڑکے کو دیکھ کر دو ایک اخروں نے ہمیں سلام کیا، چہرے دھندلے دھندلے نظر آتے تھے، قریب کی دیوار کا سایہ ایک سیاہ باڑے کی طرح تماشائوں کے چہروں پر پھیلا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے۔ چند لوگ سگریٹ پی رہے تھے، سگریٹ کا دھواں اور گرم گرم سانس کا دھواں فضا میں بل کھاتا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے آسمان پر روشن ستارے کو ڈھونڈا، جیسے بچہ خواب میں ڈر جانے پر اپنی ماں کی چھاتی ڈھونڈتا ہے، لیکن مطلع ابراؤد ہو چکا تھا اور اب تو ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی، کالی کالی دو چار چھتیاں کھل گئیں،

بھانسی کے سائے میں

لیکن بارش بالکل معمولی سی تھی، جیسے ہلکی ہلکی آدھس گردہ ہی ہو۔ ستارہ کہیں  
نظر نہ آیا۔

میں نے نا اُمید ہو کر اپنے دوست سے کہا: ”چلو چلیں“  
وہ بولا: ”بڑے بڑول ہو۔ یہ منظر تمہیں زندگی بھر اور کہیں دیکھنا  
نصیب نہ ہو گا۔“

کہیں لوہے کا ایک پھانک کھلا، پھر سفید اُجلی کپڑے پہنے ہوئے  
ایک دھیانے قد کا آدمی بھانسی کی طرف چلتا ہوا نظر آیا۔ اس کا سر منڈا ہوا  
تھا اور چہرے پر چھدری سی واڑھی تھی۔ وہ بالکل ہمارے قریب سے  
گزرا۔ اس کا چہرہ سپید اور سُستا ہوا تھا اور اس کے مات پیچھے پیچھے پر  
بندھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب ایک لمحے کے لیے رُکا اور اپنے  
پہرہ داروں سے مخاطب ہو کر بھانسی کے کالے کھمبوں کی طرف اشارہ  
کر کے بولا۔

”وہ آگئی۔ میری جان لینے والی۔“  
اس کی مسکراہٹ میں کسی مردنی تھی، اس کی آواز میں کسی تھر تھرا  
تھی، جیسے اُس زندہ جلد میں ہوتی ہے جسے چھری کی تیز دھار زخ کرنے



## پھانسی کے سلسلے میں

کے وقت چمڑے۔ اس کی چال میں کسی اکٹڑی اکٹڑی سی جھبک تھی، جیسے وہ اپنی ٹانگوں سے نہیں ٹکڑی کی ٹانگوں سے چلتا ہو۔ پھر بھی وہ بہادر آدمی تھا، دلیر آدمی تھا اور بغیر کسی سہارے کے پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا اور خدا کا نام لینے لگا، بلند، صاف، متیقن آمیز آواز میں.....!

وہ کس طاقت کو بلا رہا تھا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا: ”جہلاً و کہاں ہے؟“

جیسے میرے سوال کا جواب دینے کے لیے ایک آدمی ایک لمبا سفید کوٹ اور پتکون اور سیاہ بُورٹ پہنے ہوئے لگے بڑھا۔ اور پھانسی کی طرف چلتا گیا، اُس کے سر پر سفید گپڑی تھی، اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہو رہی تھا۔ وہ سیدھا دائیں بات کے کھجے کے قریب کھڑا ہو گیا، اور اس نے اپنا ہات لمبے کی پھر کی پر رکھ دیا۔ جس پر ریشمی ڈوری بندھی تھی اس کے دوسرے ہات میں ایک سفید کپڑے کا غلاف تھا۔

میرے دوست نے کہا: ”پرانی زمانے گئے۔ آج کل تو جہلاً و بھی بُری مشکل سے ملتے ہیں۔“ پچھلے زمانے میں کسی قاتل کا خون معاف کر دیا جاتا تھا۔ اور وہ اس کے عوض میں سزا کا رسی جلا دینا دیا جاتا تھا۔ حقیقت

پھانسی کے سامنے ہیں

یہ ہے کہ اس قاتل کو اسی جیسے معاف کیا جاتا تھا۔ اسی شرط پر کہ وہ بگڑا  
جلاؤ بن جائے۔

”اور اب؟“ میں نے پوچھا

”اب معاملہ دوسرا ہے اب تو قانون اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔

کہ محض جلاؤ بنانے کے لیے کسی کا خون معاف کر دیا جائے، اور عام طور پر  
لوگ جلاؤ کے پیشے کو... میرا مطلب ہے، اچھا نہیں سمجھتے۔“

”وہ کیوں؟ ہم قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی قتل کرے اُسے

پھانسی کی سزا بھی دیتے ہیں۔ پھر جلاؤ کے پیشے میں کیا برائی دیکھتے ہیں۔ کیا  
کہیں انسانی ضمیر کے اندر کوئی پھانس رہ جاتی ہے؟“

”جلاؤ کے پیشے کے لیے ہمیں امیدوار نہیں ملتے، درآغا لیکر ریاست

میں اس کے لیے تنخواہ بھی اور گریڈ بھی، اور ترقی کا انتظام بھی خاطر خواہ موجود  
ہے، پھر بھی.... جلاؤ بننے کے لیے کوئی راہی نہیں ہوتا۔ اور اب تو جلاؤ

کا کام بھی اس قدر آسان ہو گیا ہے۔ بس چند لمحوں کی بات ہے....“

میرا دوست کہہ رہا تھا۔ اب فیروز کی پھانسی کے لیے بھی کوئی جلاؤ

نہیں ملتا تھا۔ بہتیری کو ششش کی۔ آخر یہ آدمی راضی ہوا۔ یہ اسی جیل میں

پھانسی کے سائے میں

کپڑے بندھے ہوئے ایک مرتدہ خود بھی رشوت ستانی کے جرم میں قید ہو چکا ہے  
مریضوں کو پیٹنے میں بڑی مہارت دکھاتا ہے اور زخموں کی چیر بھار میں تو  
اس کا مقابلہ اور کوئی کپڑے بندھنے نہیں کر سکتا۔

یہ ایک فیروز نے پوچھا: ”میرے تار کا کوئی جواب آیا؟“  
ڈاکٹر نے سر ہل کر کہا: ”مجھے افسوس ہے، فیروز، تمہارے تار کا کوئی  
جواب نہیں آیا۔“

رحم کی آخری درخواست بھی ٹھکرا دی گئی تھی۔

”تم اپنے بیوی بچوں سے مل سکتے ہو۔“

یہ ایک لڑکے کا دروازہ پھر کھلا۔ اور دو عورتیں اندر داخل ہوئیں  
دونوں کے ساتھ بچے تھے، دو ننھی لڑکیاں اور ایک لڑکا اور ایک کالا  
دوپٹہ اوڑھے ہوئی عورت، دوسری عورت کے ساتھ دو لڑکے تھے جنہوں  
نے چھوٹی چھوٹی سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ دوپٹی ٹوپیاں۔  
دائیں کھبے پر کالے دوپٹے والی عورت کھڑی ہو گئی، بائیں کھبے پر  
وہ لالائیں اور اس کے لڑکے۔

”یہ کیا تماشہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

## پھانسی کے سائے میں

میرے دوست نے جواب دیا: ”وہ لالائیں مقتول مہاجن کی بیوی ہیں۔  
وہ اس کے دونوں لڑکے ہیں۔“

فیروز نے ہنس کر کہا: ”چھوٹے شاہجی، اپنے باپکے قاتل کی پھانسی  
دیکھنے آئے ہو۔“

میں نے کہا: ”یہ انتہائی ظلم ہے، ان لوگوں کو یہاں نہ آنے دینا چاہیے۔“  
میرا دوست بولا: ”پہلے تو اس ریاست میں کیا ساری دنیا میں سڑاؤ  
پھانسی دی جاتی تھی تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو۔“

”چھوٹے شاہجی کا اب کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔“ فیروز نے تلوار کی دھار  
کی طرح تیز لہجے میں کہا۔

دائیں طرف اس کی بیوی اپنے بچوں کو لیے کھڑی تھی۔ لیکن فیروز  
نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ عورت اس کی طرف تکھی گئی، اور فیروز،  
لالائیں اور اس کے بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔

یہ ایک فحشی لڑکی نے بات پھیلانے اور کہا: ”ابا!“

”ابا!“

”ابا!“

پھانسی کے سامنے میں

فیروز نے ایک لمحے کے لیے شمال مشرق کی طرف مڑ کر دیکھا۔ لیکن  
روشن ستارہ کہیں نہ تھا۔ چاروں طرف بادل چھاٹے ہوئے تھے اور ہلکی  
ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دوست سے کہا: ”یہ انتہائی مظلم ہے۔ ان بچوں کو یہاں  
آنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔“

طرکی نے کہا: ”آبا..... آبا..... آبا!!“

فیروز نے آہستہ سے جلا دے کہا: ”مجھے جلدی سے غلاف اٹھا  
دو میں اپنی پجیروں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“

میرے دوست نے جبل کے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہا۔ اس نے  
حکم دیا کہ اب دونوں عورتوں اور ان کے بچوں کو واناں سے پرے ہٹا  
دیا جائے۔

وہ ہے کا پھانک ایک بار پھر کھلا اور لالائین اور اس کے دونوں  
بیٹے باہر چلے گئے۔ فیروز کی بیوی ایک بارڑکی، مٹری اور چیخ مار کر اپنے  
خاوند کی طرف بڑھنا چاہتی تھی، کہ پہرہ داروں نے اُس کے منہ پر بات  
لکھ دیا اور اُسے لٹھے کے پھانک کے باہر دھکیل کر دوڑ کہیں جبل خانے

بھانسی کے ساتھ میں

کے دوسری طرف لے گئے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ساٹھ پانچ بجنے میں چارمنٹ باقی تھے۔  
”تم کچھ کمنا چاہتے ہو فیروزا ڈاکٹر نے پوچھا۔

”دعا کرو۔ میرے لیے دعا کرو۔ سب لوگ میرے لیے دعا کرو۔“

فیروز کی کوہا اس غلاف کے اندر سے اس طرح آ رہی تھی، جیسے وہ کسی

تاریک اندھے کنوئیں میں بول رہا ہو۔“

جلاد نے ریشمی ڈوری کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور پھندے

کی گمانٹھ کو اس کے گلے میں فٹ کر دیا۔ انصاف کی رسی!

فیروز زور زور سے اور تیزی سے اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔

وہ کس طاقت کو بلاتا تھا!

ایک منٹ گزر گیا۔

دوسرا منٹ گزر گیا۔

تیسرا منٹ گزر گیا۔

چوتھا منٹ گزرا۔ ٹین ایل خانے کے گھڑیاں نے بجایا۔ گرنج

نصایں تھرانے لگی۔

## پہانسی کے سائے میں

ڈاکٹر نے سفید رومال ہلایا اور دانتیں کھبے کی پھر کی ہلی، اور پہانسی کا تختہ بیچ میں سے شق ہو گیا، اور عین اُسی لمحے فیروز بہاری آنکھوں کے سامنے سے گم ہو گیا، وہ اب ان دونوں تختوں کے نیچے اندھیرے کمزوں میں اُسی ریشمی ٹودھی سے لٹکا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

صرف چند سیکنڈ کے لیے لاش تڑپتی، جس طرح بجلی کا تار جسم سے چھو جائے۔ ایک سیانی اضطرابی حرکت، کرب اور بے چینی، اور مہیب اضطراب، جیسے لاکھوں ٹن پانی کا طوفان یکایک جہاز سے ٹکرا جائے جیسے ریتا ہوا لاوا یکایک کسی آتش فشاں چوٹی سے پھٹ پڑے اور فضا میں آگ بہی آگ برساتے، جیسے خون کی ہر بوند میں اور دماغ کی ہر نس میں بارود کا فلیٹہ یکایک بجک سے اُڑ جائے، نہیں، جب بھی نہیں، اس تڑپ، اس اضطراب، اس کرب کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے، جب روح اور جسم اس طرح زبردستی ایک دوسرے سے جدا کیے جاتے ہیں۔ وہ اضطراب، وہ حرکت، وہ تڑپ، بجلی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح میری روح کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو مٹنے دیکھا۔ اپنے ایمان کو خاکستر کرتے دیکھا، اپنے تہذیب و تمدن کو خوار و خوار

## پھانسی کے سامنے میں

کی طرح جلتے بجتے دکھیا، وہ انسان، وہ اس کا خدا، وہ اس کی تہذیب جس نے اس پھانسی کو روا رکھا ہے جس نے خون کا بدلہ خون میں لینا چاہا ہے۔ کبھی پنپ نہیں سکتے، کبھی اٹھ نہیں سکتے۔ کبھی بلند نہیں ہو سکتے۔ فیروز کی صورت یاد نہیں۔ ہاں یاد کے ہر کرنے میں پھانسی کا ایک تختہ دیکھتا ہوں، جس پر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس صورت دیکھتا ہوں اس کا چہرہ غلاف کے اندر ہے اور اس کے بازو نیچے بندھے ہوئے ہیں۔

یہ صورت، جب بھی اکیلا ہوتا ہوں، میرے سامنے آتی ہے اور ایک خاموش گلہ بن کر مجھ سے پوچھتی ہے، مجھے جانتے ہو میں انسان ہوں۔ نیکی اور بدی کا پتلا، اذلی، ابدی انسان، تم نے مجھے اک ریشمی ڈوری سے اندھے کنوئیں میں لٹکا رکھا ہے، کیا مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوگی۔



## بھوت

بارش ہو رہی تھی۔ گزشتہ پانچ روز سے متواتر موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔ بادلوں کا رنگ دھواں دھواں تھا، اور زمین مغل، پانی میں بھیگی ہوئی سبز نخل جس پر پاؤں پھسلتے تھے اور پانی کے پلے بہتے اور پھٹتے تھے۔ فضا میں گرتی ہوتی بوندوں کا اند دہناک شور تھا اور ٹھری ہوئی مٹی کی باس۔ مینڈک پانی کی وقتی جھیلوں میں ٹراتے تھے۔ ایک بہت بڑا بھوسے رنگ کا مینڈک ان کے سامنے سے پھدکتا اور ریل کی پٹری کو پار کرتا ہوا گئے بھل گیا۔ سگن مائے کی کرٹھری کے پاس ایک بھینس چر رہی تھی، مینڈک اس کے پاؤں تلے آگیا، عاوض، اتفاق، خدا کسی کو کیا کہیے۔ زندگی مورت

میں مبتدل ہو چکی تھی۔

گاڑی آنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ اس نے ٹکٹ خریدا، چھاتا کھولا۔ چنے والے سے چنے کھائے، اخبار پڑھا۔ بوٹ پر پالش کرایا۔ سر کھجایا۔ اٹھ کر ٹیلا۔ ٹیل کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک چھڑا سا مصافحاتی اسٹیشن تھا۔ بمبئی سے انیس میل دور، اور یہ انیس میل۔ اس وقت ہزاروں میل معلوم ہو رہے تھے، پلیٹ فارم کی گھڑی کی سوئیاں گویا مدت سے ساکن تھیں۔ شاید یہ کینٹ بھی گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں۔ اُس نے جھائی لی۔ ادھر ادھر دیکھا، کہیں کوئی خوبصورت عورت بھی تو نہ تھی۔ نگاہ کہیں نہیں رکتی۔ روپے کے رنگ آلود تاروں پر کوئے ٹھٹھڑ رہے تھے۔ نم آلود پنجوں پر کائنات کی بد صورت ترین مخلوق بیٹھی ہوئی پان کی جگالی کر رہی تھی، مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ رانیں سہارا کھا رہی تھیں۔ چنے کی خشک دال میں، کاندہ نمک اور سرخ مرچ اور نمہ کاراں ڈال کر اپنے دانتوں کی چکی تلے ہیں رہی تھی اور بار بار آنکھیں جھپک کر ریل کی چمکتی ہوئی لائن دیکھتے ہیں مصروف تھی۔۔۔ گاڑی۔۔۔ کہیں کوئی گاڑی نہ تھی۔ ریل کی چمکتی ہوئی پٹری دور فصائیں گم ہو رہی تھی۔ اور پانی برس رہا تھا اور مینڈک ٹرا رہے تھے۔

اگر وہ پانچ منٹ پہلے آجاتا تو بوری دلی سے آنے والی گاڑی پر سوا  
 ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب چھ بج چکے تھے۔ اور اُسے دوسری گاڑی  
 کا انتظار تھا جو پونے سات بجے آئے گی۔ اُس نے چھانا اُٹا کر اسٹیشن  
 کے ایک کھجے سے لگا دیا اور قریب ہی ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ جس پر جلی  
 حروف میں لکھا تھا۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی عورتوں کے لیے۔ تو اُسے  
 پلیٹ فارم پر پہلے اور دوسرے درجہ کی ایک عورت بھی نظر نہ آئی  
 تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کے بچوں پر عورتیں اور عورتوں کے بیچ پر مرد  
 بیٹھے تھے۔ اس نے سوچا اس مرد میں بھی کس قدر رزم کا پہلو نمایاں ہے۔  
 لیکن کینجٹ اسٹیشن ماسٹر کو اپنی پتلون کی لوک پک درست کرنے ہی  
 سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ پلیٹ فارم کا اخلاق کیسے سمجھ سکتا ہے  
 چھاتے کی ورائنگانیوں سے پانی ٹپ ٹپ کر کے بہا تھا۔ اور فرش پر بہتا ہوا کچھ  
 لکھتا جا رہا تھا ناگری کے حروف اردو کے حروف۔ گیدڑ کا منہ شیر کے ایال  
 جناح کا چہرہ گاندھی کا جبرہ۔ چرچل کا سگار۔ ہند کی ٹکونی چھت جو دیکھتے دیکھتے  
 مسجد کے گنبد میں تبدیل ہوئی اور پھر گاتھک گرجا کی صورت میں نمودار ہوئی  
 اور پھر ایک عالی شان محل کا کھنڈر بن گئی۔ قطرہ قطرہ کے پانی بہا تھا۔ اور ایک

ہی ظلم کی نرک سے مختلف زبانیں تہذیبیں شخصیتیں اور مذاہب ایجاد کرتا  
چلا جا رہا تھا۔ اب چھاتے کی ٹری ہوئی ہستی کے نیچے بہت سہاگنی جمع ہو  
کر ایک چھوٹی سی جھیل بن گیا۔ وہ منہج تھا تو یہ منزل ہے۔ اس نے سوچا  
جہاں سب تہذیبیں اور کلچر اور شخصیتیں گڈاڑ ہو جاتی ہیں۔ پانی بھی  
خوب چیز ہے صاحب! ہندو پانی، مسلم پانی اور پھر۔۔۔ چھاتے کا پانی!  
— گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔

ملاڈ سے چرچ گیٹ تک جانے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہو گا۔ اس  
خیال سے اس کی کنپٹیاں ٹکینہ لگیں اور اسے اسپرو کے پکیٹ کی ضرورت  
محسوس ہوئی۔ لیکن ملاڈ تو ایک فیل سٹافاتی اسٹیشن تھا، یہاں اسپرو  
تو کیا جھگر کی بوتل بھی مہیا نہ ہو سکتی تھی جھگر کی بوتل سے اس کے سر کا درد  
کیسے دور ہوتا لیکن وہ جھگر کی بوتل ضرور پینا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ملاڈ اسٹیشن  
سے فوراً رخصت ہو جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کی فضا میں برستی ہوئی بارش  
کی انا سی تھی اور مینڈک ٹرا ہے۔ تھے اور غلیظ کوئے رنگ آلود تاروں  
پر بیٹھے ہوئے اپنے ناپاک جسموں کو اپنی کالی چونچوں سے صاف کر رہے  
تھے اور گندے امیر و کبیر مارواڑی دھرتیوں سے جوئیں چھنے میں مصروف

تھے۔ اور مثیال مثیالی عورتوں نے ایک ہی قسم کے پھول ایک ہی طرح پر اپنے  
 جوتوں میں لگا رکھے تھے اور سیدھی مانگ نکال کر اپنے بالوں میں کھوپرے  
 کا تیل لگا کر انہیں پالش کیے ہوئے بوٹ کی طرح چمکایا ہوا تھا۔ اور وہ سیدھی  
 مانگ دود سے بالکل ریل کی پٹری معلوم ہو رہی تھی۔ اور گاڑی ابھی تک نہ  
 آئی تھی۔ عورت اور ریل کی پٹری میں کیا فرق ہے۔ اس نے سوچا ریل  
 کی پٹری کسی اسٹیشنز پر ٹھہرتی ہے۔ عورت صرف ایک اسٹیشن  
 پر، اور اگر ایک سے زیادہ اسٹیشن پر ٹھہرے تو عورت نہیں طوائف کہلاتی  
 ہے۔ انتظار دونوں کے لیے کرنا پڑتا ہے اور جو انتظار میں ہے وہ  
 گاڑی پر چڑھنے میں نہیں عورت تک پہنچنے کے لیے اس سے شادی کرنا  
 پڑتی ہے اور گاڑی کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے اور جو لوگ بے ٹکٹ  
 سفر کرتے ہیں۔ وہ سماجی اعتبار سے بد اسنلاق سمجھے جاتے ہیں۔  
 گاڑی ہو یا عورت۔ بے ٹکٹ سفر کرنے والے کہہ حالت میں نہرا سکتی ہے  
 تو بہ۔ تو یہ کیسی بڑی بڑی باتیں سوچ رہا تھا وہ اس کے کنوا سے جذبات  
 خطرناک حد تک بد اخلاقی کے مرکب ہو رہے تھے۔ اب اُسے ازدواجی  
 زندگی کا ٹکٹ خریدنا ہی پڑے گا۔

اب گھاڑی ابھی چمکے۔ اُس نے پیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔  
 ابھی صرف دس منٹ گزے تھے صرف دس منٹ بہ اور وہ اپنی دانت  
 میں کئی عرصے گزار چکا تھا۔ وہ چھپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے  
 میں آیا۔ پھر اپنے بچپن کے سہانے خوابوں کی سمت لوٹ چلا تھا لیکن  
 گھاڑی پھر بھی نہ آئی تھی۔ اور ابھی صرف دس منٹ گزرے تھے اس نے پالش  
 والے لڑکے کو آواز دی۔ اے اور لڑکے پالش والے!

پالش والا لونڈا ایک نتھنے میں اٹکل ڈال کر گنگنے الفاظ میں بولا:

”صاحب ابھی تو ترا بوٹ پالش کیا ہے؟“

”کئی ہرج نہیں۔ اسے پھر پالش سے اچھی طرح چمکائے دیکھ اب  
 کے اچھی طرح سے پالش کیجو دو آنے دوں گا۔“

پالش والے نے اس کے پاؤں اپنی پٹی ہوتی نیکر پر رکھ لیے۔ نیکر جو کبھی  
 خالی رنگ کی تھی۔ لیکن اب جگہ جگہ سے پھٹ کر بے رنگ ہو چکی تھی۔  
 پالش والے کی ٹانگوں پر چھوٹے چھوٹے بے شمار زخم اور پھینسیاں تھیں۔ اس  
 کے ننگے پاؤں میں بیاتیاں پھوٹ آئی تھیں۔ اور اُس کی ناک سے نزلہ سُتر سُتر  
 کر کے بہتا تھا۔ لیکن پالش والا لونڈا بھی بڑا ہوشیار تھا۔ وہ اپنے

ہستے تھنے تھلے کو ایک ہی بار سانس کھینچ کر فوراً ناک کے اندر لے جاتا تھا تھوڑی دیر کے بعد نزلہ پھر اس کے نٹھنوں سے بہنا شروع ہو جاتا۔ وہ سوچتا کہ اب گرا۔ یہ نزلہ میرے بوٹ پر آب گرا۔ لیکن پالش والا لوندھا بڑا ہوشیار تھا اس نے پھر زور سے سانس لے کر نزلہ کے لعاب کو ناک کے اندر کھینچ لیا اور برش کو زور زور سے بوٹ پر رگڑنے لگا گاڑی پھر بھی نہ آئی۔ شاید یہ گاڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اس نے پالش والے سے کہا۔ بوٹ کے تسمے کھول دو۔ اور بوٹ الگ لے جا کر پالش کرو۔ اس نے سوچا۔ چلو تسمے کھولنے ہی میں کچھ وقت صرف ہو گا۔

گاڑی ابھی تک کیوں نہیں آتی۔ پلیٹ فادم کی گھڑی اس قدر سست کیوں ہے۔ بارش اس طرح کیوں برس رہی ہے۔ کیا یہ اب کبھی نہیں گڑے گی! ریلوے والوں نے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے بچوں کے سامنے کھیر لی لٹا دیے تھے۔ پر تسمے کے لیے نہیں، بارش کی بو چھاڑ سے بچنے کے لیے وہ ریلوے کا تہ دل سے شکر گزار تھا۔ لیکن اُسے اس وقت کھیر لی کی نہیں، ایک گاڑی کی سخت ضرورت تھی جو اُسے چند لمحوں میں ملاؤ سے چرچ گیسٹ پہنچا دے۔ جہاں اس کی محبوبہ اس کا انتظار

کر رہی تھی۔

چرچ گیٹ پر اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے اور وہ ملاڈ میں کھڑی کے ایک گلیے ٹرے بوسیدہ بیچ پھینچا اپنے جوتوں پر پالش کر رہا ہے اور پالش والے نوٹے کی ناک سے ہوتا ہوا نزلہ دیکھ دیکھ کر خود کشی پر آمادہ ہو رہا ہے۔ گاڑی نہیں آئی۔ ضرور کوئی حادثہ ہو گیا ہے کوئی کھمبا گرا ہو گا۔ آزاد کی پسندوں نے پٹری توڑ دی ہوگی۔ ریل الٹ گئی ہوگی، یہ گھڑی غلط ہوگی۔ بجلی کے تار فیصلے ہو گئے۔ سگنل بظاہر گناہ راستے میں پل طوفانی ہو گیا ہوگا۔ سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گاڑی کے سر سے گزر گیا ہوگا۔ ورنہ گاڑی ابھی تک آگئی ہوتی!

آج فتح کی خوشی میں وہ چرچ گیٹ جا رہا تھا۔ جہاں نیلا ریشمی سایہ پہنے اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ آج اُس نے وہی نیلا ریشمی سایہ پہنا ہوگا جو اسے بہت پسند ہے۔ اور جس کے دام ابھی اُس نے دزدی کو ادا نہیں کیے۔ کافول میں الکتھ و پٹیدنگل کے آویزے ہوں گے۔ بڑے بڑے ہلالی آویزے۔ عید کے چاند کی طرح خوبصورت اور اسی آویزوں کے بیچ میں موتی ٹکے ہوں گے۔ موتی، ابدار موتی، دکھوتی



ہچکچاہٹ، طرح دار موتی .... ایس۔ اُس نے اپنے اُلجھے ہوئے تصور میں کُڑیوں  
 کو بازاری کتابوں کے ناموں سے کیوں گڈگڈ کر دیا تھا۔ اس کی محبوبہ تو بازاری نہیں تھی  
 بے حد شریف لڑکی، نیلا سایہ اور سفید سینڈل پہننے والی لڑکی۔ گوڑے گورے  
 چمکے دھاڑوں والی ہنس ہنس کر اُتو بنانے والی لڑکی اور پھر پیچھے شکر کر انگیر کی نظر کا  
 نگاہوں سے خراج وصول کرنے والی۔ بے حد شریف کنواری لڑکی، پھر  
 لکھتی خاندانی لڑکی، چرچ گیٹ پر اُس کا انتظار کر رہی تھی اور گاڑی ابھی اُٹی  
 نہ تھی۔ اور آج فتح کا دن تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی۔ اور دنیا نے  
 تھک کر امن و چین کا سانس لیا تھا، جرمنی — اور پھر جاپان  
 شکست خوردہ ہو کر ہتھیار ڈال چکے تھے اور اُس کی محبوبہ نے نیلا ریشمی  
 سایہ پہنا تھا۔ جس میں اُس کا چہرہ رانا زک قناسب جسم کنواری بہاروں  
 کی طرح شگفتہ و شاداب نظر آتا تھا۔ دنیا میں بہار آگئی تھی اور وہ ملاٹھیں  
 جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔

آج گاڑی نہیں آئے گی۔ آج وہ فتح کا جشن نہیں مناسکے گا۔ امن کی  
 مستروں میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ فردا ایریا میں گھومتی ہوئی، قمقموں سے  
 جگمگاتی ہوئی ٹراموں کی روشنی نہ دیکھ سکے گا۔ ڈیمو کراسی کے سپاہیوں

کو جام پر جام لٹھکتے اور ابدی امن کے ترانے گاتے نہ سن سکے گا۔  
 ناچ گھر میں نیلے سایہ کے محور کے گرد طواف نہ کر سکے گا جو ٹہو کے ساحل  
 کی ریشمی ریت پر ٹا کر اُس کے ہونٹ نہ چوم سکے گا۔ بس آج وہ جوتے  
 پالش کرائے گا۔ اور ناک سے بہتے تھے تڑے کو اندر سے باہر اور باہر  
 سے اندر جاتے ہوئے دیکھتا ہے گا۔ اور اس کی مجبورِ نا امید ہو کر واپس  
 چلی جائے گی اور قہقہے سمجھ جائیں گے اور مسکراہٹ سمجھ جائے گی اور  
 مسرت کے ترانے خاموش ہو جائیں گے اور بھگی بھگی گھاس پر میڈیک  
 ٹراتے رہیں گے اور لا پرواہ جینسوں کے پاؤں تلے کچلے اور ملے جائیں گے  
 بالکل اسی طرح جیسے اب اس کا دل سلا اور کچلا جا رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی نہیں  
 آئی تھی۔ فرطِ یاس سے مغلوب ہو کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے اُس کی نگاہ ایک ٹوکے  
 پر پڑی جو اب اس کے قدموں کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا جو  
 ابھی ابھی یہاں رکھا گیا تھا۔ اس ٹوکے میں مچھلیاں تھیں، سمندری مچھلیاں  
 موٹی پتلی، اُلٹی سیدھی، چھوٹی بڑی ہر قسم کی مچھلیاں — اور اس ٹوکے

کے پاس ایک نیم برہنہ انسان بیٹھا تھا۔ جس نے تاڑی پی رکھی تھی۔ اور جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکار رہا تھا۔ اُس کا سیاہ گٹھا ہوا جسم خوبصورت تھا۔ دانت مضبوط اور سپید، دھڑ سے اوپر ننگا، پاؤں ننگے اور ادھی رانیں بھی ننگی صرف کمر کے اوپر کسی پرانی دھوئی کا پتھر ٹاٹا، گیلیا پتلا، بارش کے پانی سے شفاف ہو گیا تھا۔ کپڑا نہ تھا۔ ایک آئینہ تھا جس میں انسانیت کا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ ماہی گیر نہ تھا۔ اس کے خدو خال بھیلوں کے سے تھے آنکھوں میں جنگلی وحشت تھی۔ بازوؤں میں ایک رُکی ہوئی جابر تو انانی، اعضا میں اک لچک، لوچ اور گھلاوٹ، جیسے وہ کسی مذہبِ بستی کا انسان نہ تھا۔ جنگل کا خوبصورت جانور تھا۔ اور مچھلیاں پکڑ کر لایا تھا۔ اور تاڑی پی کر رہا تھا۔

قریب ہی اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ وہ بھی نیم برہنہ تھی۔ اور ایک نحیف و نزار بچے کو اپنی گود میں لیے ہوئے تھی۔ اور اپنے تندرست تھنوں سے اسے دودھ پلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں اپنی ناکامی کا ماتم بھی کرتی جا رہی تھی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں سے

ٹپک رہی تھی۔ اور وہ ایک بچے کی طرح تھی۔ جس کا عزیز ترین کھلونا اس سے چھینا جا رہا ہو۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا نخیٹ و نزار بجا بچے قے پر قے کر رہا تھا۔ اور اس کا دم اُلٹ رہا تھا اور پلیٹ فارم کا فرش غلیظ ہو گیا تھا اور بچے کی گردن ایک طرف جھک گئی تھی۔ اور وہ بھیل یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور اس نے تارڑی پی رکھی تھی۔

بچے نے پھرتے کی، اور وہ لڑکی زور زور سے چلنے لگی مگر بھیل اُسے پیٹنے لگا اور لڑکی نے ساگ کا ٹٹھا بھیل کے سر پر ڈے مارا۔ اور لوگ ہنسنے لگے اور پھر وہ بھیل خود بھی ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی۔ جیسے وہ آدمی نہیں تھا۔ پاگل تھا۔ ایسی بھی کیا ہنسی۔ مانا کہ آج جشنِ آزادی ہے۔ جشنِ فتح ہے۔ آج دنیا کو فاشیت کے چنگل سے نجات ملی ہے۔ اور ہندوستانی کا ہر ہوٹل مسرت کے نغمے گا رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کریوں بے سوچے سمجھے تارڑی پی کر رہنا جائے۔

چھوٹے بچے کا سر ایک طرف ٹھٹک گیا تھا اور وہ نیم برہمہ بھیلنی بیٹھی ہوئی اپنی پٹی ہوتی دھوتی سے اس کی قے صاف کر رہی تھی۔ اور

پولیس میں اسے اس طرح غلامت پھیلائے پہگالیاں مسدود تھیں۔ اور اس کے پستان ننگے تھے۔ اُس کی باہیں ننگی تھیں۔ اور کاٹھن مارکیٹ میں کروٹل من روٹی کے انبار لگے تھے۔ اور اس کا پیٹ ننگا تھا۔ اور اس پر اک خوفناک ناگ کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ اور اس کی باہنوں پر بھی خوفناک دیوتاؤں کی سبز تصاویر کھدی تھیں۔ شاگ کسچنج میں سونے چاند اور روٹی کا بھاؤ گر رہا تھا۔ لیکن وہ نیم برہنہ تھی۔ اور اُس کی ننگی باہوں میں لکڑی کے موٹے کرے تھے۔ سونے کے نہیں، چاندی کے نہیں پینٹل یا تانبے کے بھی نہیں صرف لکڑی کے۔ اور ٹخنوں پر پائل کی تصویر کھدی تھی۔ کیونکہ جب عورت کو زیور نہ ملے تو وہ اُس کی تصویر دیکھ کر ہی کیوں نہ خوش ہو۔۔۔۔۔؟

اس کا لڑکا اس کی گود میں دم توڑ رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ اور پولیس میں اسے گالیاں مے رہا تھا۔ اور اُس کا خاندن تاڑی کے نشے میں دھت، اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ وہ ننگا تھا۔ اور اس کی بیوی ننگی تھی اور اُن کے آنسو ننگے تھے اور ان کی ہنسی ننگی تھی۔ کیونکہ بھیل سے اس کا جنگل چھن گیا تھا۔ اُس کا درس چھن گیا تھا اُس کے تیر و کماں

چھن گئے تھے۔ اب وہ اپنے گھر میں بے گھر تھا بے ہتھیار تھا بے علم تھا۔ جنگل چھنا۔ لیکن شہر نہ ملا۔ جنگل کی چھال چھنی لیکن روٹی کا سوت نہ ملا۔ شکار چھنا۔ لیکن روٹی نہ ملی۔ تیردکان چھنے۔ لیکن بندوق نہ ملی۔ جڑی بوٹی چھنی لیکن دوا نہ ملی۔ وہ نہتا تھا۔ بے یار و مددگار تھا۔ اور مچھلیوں کا ٹوکرا لیے۔ پلیٹ فارم پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔ اس نئی دنیا میں جہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

اس کا جھوٹا ہوا سر اور بھی جھولنے لگا۔ اور ریل کے کھجے کا سہارا لے کر اپنے پیٹ پر جھبک گیا۔ یکا یک اُس کی بیوی نے ایک چیمکے ساتھ اپنے سر کو دوہتر سے پیٹ ڈالا۔ کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ بار بار تے کرنے والا غلیظ لڑکا اس دنیا سے چل بسا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر اگئی تھیں اور وہ بیوقوف عورت بار بار اپنے جوان پستان اس کے مردہ ہونٹوں میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لیے کہ اس کی بامتا کے پاس اپنے دودھ بھجے پستانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوا کیا ہے۔ کھانا کسے کہتے ہیں منجھن اور دودھ، گلو کوس اور وٹامن اور کالوے کو روکنے والے انجکشن اور ڈاکٹر لوگ یہ سب کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

ریشم کیا ہے سینڈل کیا ہے پتلا سایہ کیا ہے آرام کیا ہے کتاب کیا ہے  
 علم کیا ہے تہذیب کیا ہے ہونٹ کیسے مسکراتے ہیں آنکھیں کیسے جھلکتی ہیں  
 سانس میں خوشبو کا تعطر کیسے پھیلتا چلا جاتا ہے اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ فتح  
 کسے کہتے ہیں ناشترم اور ڈیموکریسی اور جنگ اور امن میں کیا تفریق ہے۔ اے  
 کچھ بھی تو معلوم نہ تھا وہ یکایک اپنے مردہ بچے کو لے کر کھڑی ہو گئی۔ چمکتے ہوئے  
 بالوں والی عورتوں سے جوئیں چھنے والے امیر و کبیر مار واطری سے  
 سیٹی بجاتے اور اپنی پتلون کی نوک پلک سنوارتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر  
 سے اس کی حیران پھٹی پھٹی نگاہیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اُس کے چمکدار  
 بوٹ کی نوک سے کچھ پوچھ رہی تھیں اور جب کہیں بھی انھیں اپنے سوال  
 کا جواب نہ ملا تو اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں اور ہراساں ہو کر زمین پر  
 بیٹھ گئی۔ جیسے اس نے اس ذلیل مضافاتی اسٹیشن پر آدمیوں کا نہیں  
 چٹانوں کا منہ دیکھا تھا۔

گاڑی اب دور سے نظر آ رہی تھی۔ اور اس کا جو تاشاف آئینے کی  
 طرح چمک رہا تھا اور اس نے صاف ستھرے چمکتے ہوئے جوتے کی  
 نوک سے جھولتے ہوئے بھیل کو ایک ٹھوکا دیا۔ بھیل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

گاڑی انگوٹھی بچیل نے اپنے سر پر مردہ مچھلیوں کا ٹوکرا رکھا، بغل میں مردہ  
 بچے کو دبایا۔ ہاتھ سے سسکتی ہوئی بیوی کو پکڑا اور تھرڈ کے ایک ڈبے  
 میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہوں میں وہی وحشت تھی۔ لبوں پر وہی ہنسی۔  
 اور — وہ — فرسٹ کلاس کے نرم گدیوں پر بیٹھ کر بھی اکبر مرزا  
 کا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے بزدل ذہن میں لکھوں کروڑوں ننگے،  
 بھوکے پیاسے بیمار آدمی ابھر رہے تھے۔ گھٹتے چلے آ رہے تھے۔ اُس کے ذہن  
 کے نرم نرم گداز گدیوں پر بیٹھنے جا رہے تھے۔ اور اُس کی طرف دیکھ دیکھ  
 کر ہنس رہے تھے۔ یہ ہنسی کیا ہے۔ یہ کسے لگے۔ میں پھندا سا کیوں ہے۔ یہ  
 کس کے ہاتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ پھیلے پھیلے، ٹیڑھے ٹیڑھے لمبے  
 لمبے ہاتھ، سوکھے سکرٹے، سسے سسے ہاتھ، کمزور ہاتھ، قوی ہاتھ، وحشی ہاتھ  
 بزدل ہاتھ، دلیر ہاتھ، کالے ہاتھ، گورے ہاتھ، پیلے ہاتھ، کرنجی بدنما ہاتھ، ہاتھ  
 — جن پر زخموں کے نشانی تھے۔ کوڑوں کے نشان تھے۔ ہل کی ہتھی  
 کے نشان تھے۔ شیش چلانے کے نشان تھے۔ تیل کے نشان تھے۔ گویوں  
 کے نشان تھے — ہاتھ — جن پر انگلیاں زخموں سے لپکتے ہوئے ہاتھ —  
 جن پر ہنسی دیدیں ابھری ہوئی تھیں۔ کا پتے ہوئے ٹھنڈے، خون سے لگتے



## بھوت

ہوئے لمبے لمبے ناخن والے ہاتھ جو ننگے تھے۔ اور خون آنسو تھے اور  
 ناسوروں سے بھرے بھٹے تھے اور اس پر ہنس رہے تھے۔ ان کی  
 خاموشی میں ایک مہیب گویائی تھی۔ ان کے تاریک سائوں میں ایک  
 عجیب گونج تھی۔ کسی خوفناک طوفان کی گونج..... اور یہ ہاتھ ٹٹتے چلے  
 آ رہے تھے۔ لگے، اور آگے قریب اور قریب.....!

وہ چیخ مار کر صوفے پر سے اچھل پڑا۔ سامنے کی سیٹ پر ایک انگوٹہ  
 سپاہی اپنی سالولی محبوبہ سے ریشمی نیلا سایہ پہن رکھا تھا اظہارِ محبت  
 کر رہا تھا۔ انگریز سپاہی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے جانی؟ ڈر گئے تھے کیا؟“

”ہاں میں واقعی ڈر گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”کس سے؟“

”ابھی ابھی میں نے اک بھوت دیکھا تھا۔“

”بھوت؟ اس گاڑی میں؟“ ساتھی نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”نہیں سچ کہتا ہوں۔ بھوت تھا!“

”کس کا بھوت تھا؟“ اس نے اپنی محبوبہ کی ترش ہوتی زلفوں سے  
کھیلتے ہوئے پوچھا۔

”تیسری جنگِ عظیم کا بھوت“ اُس نے رکتے رکتے کہا۔  
انگریز سپاہی اور اس کی سانولی محبوبہ کے چہرے فنی ہو گئے۔ ڈبے  
میں سناٹا چھا گیا۔ موت کا سا سکوت، جیسے اب وہاں کوئی نہ تھا اور  
اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ڈبے کے کسی کونے میں کھڑا ہوا وہ بھیل ابھی تک  
ہنس رہا ہے!

## تین غنڈے

اس کا نام عبد الصمد تھا۔ وہ بھنڈی بازار میں رہتا تھا۔ محض اسی لیے بہت سے لوگ اُسے غنڈہ کہتے تھے۔ ہر گارجہ الصمد بھی غنڈہ۔ گو اس بے چارے کو زندگی بھر یہ پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے۔ بالعموم لوگوں کو اپنی زندگی میں اپنے باسے میں تھوڑا بہت معلوم رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ انہیں اچھا سمجھتے ہیں۔ یا بُرا۔ وہ شریفین ہیں یا بد معاش، عورتوں کو اپنی ماں بہن سمجھتے ہیں یا اپنی ہونے والی محبوبہ، وہ دیانت دار سمجھے جاتے ہیں یا جھوٹے۔ دروغ گو، ناسد یا اس پسند انہیں کچھ نہ کچھ پتہ چلتا رہتا ہے اپنے متعلق۔ لیکن بیچارے عبد الصمد کو آج تک کمر میں گولی لگنے تک

## تین غنڈے

پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے اسے گولی کیسے لگی یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عبد الصمد ایک غنڈہ تھا جو فائن آرٹ اینڈ پرنٹنگ ورکس میں کام کرتا تھا جو وزیرہ مستور اہل کے قریب ایک سرسبز ایٹھون دانی دو منزلہ عمارت میں واقع ہے اور جس کے سامنے ٹرام کا اڈہ ہے اور جو آج کل جہن کر کوئٹہ ہو چکا ہے ہندوستانی اور انگریزوں کی دیرینہ رقابت کی وجہ سے اس رطانی میں ہندوستانیوں کی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوتا ہی لیکن بے چارے انگریزوں کے کئی ہزار لاکھ تو اس مفت میں پھنک گئے۔

عبد الصمد ہی فائن آرٹ پر میں میں ملازم تھا۔ لشکر کے بھاری پتھر اٹھا کے مشین پر جھاتا تھا۔ یہ اس کا کام تھا۔ دوسرے مزدور تو مشکل سے ایک پتھر ایک وقت میں اٹھا سکتے تھے۔ لیکن عبد الصمد کے کام کرنے کا انداز یہ تھا۔ کہ پانی کی پیک زور سے سامنے تالی میں پھینک کر ایک موٹی سی گالی دے کے وہ بیک وقت دو پتھر اٹھا لیتا اور انہیں جہن عزیز کی طرح سینے سے لگاتے ہوئے منیجر کی میز کے پاس سے گزر کر سکر ایک ایک آنکھ میچی کر دل ہی دل میں منیجر کو ایک موٹی سی گالی دے کر وہ دونوں پتھر مشینوں

پر حملے کے لیے جاتا۔ اور سنس کر مشین میں سے کتا، بیٹا بھیکے ابلغنی  
 جماد مشین چلانے کو وہ فلفی جمانا کستا تھا۔ دراصل اس کی اپنی زبان تھی جن میں  
 وہ زندگی کے اہم موضوعات پر گفتگو کیا کرتا۔ جب مالک پریس میں آتا تو چپکے  
 چپکے مزدوروں سے کتا۔ شیر آیا شیر آیا دوڑنا۔ جب مالک نہ ہوتا اور منجروں  
 سے چلانے لگتا۔ تو کتا کام کر دے۔ کرو کام سُر کی اولاد۔ دیکھتے نہیں ہو  
 گیدڑ کی بیوی روتی رہی ہے۔ جب تنخواہ کا دن آتا تو کتا۔ آج بیچا لے  
 کا چٹم بچتا ہو گیا۔ یہ چٹم بچتا کس زبان کا لفظ تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس نے  
 کہاں سے سیکھا تھا۔ اس امر کو کئی نہیں جانتا۔ یہ عبد الصمد کی زبان تھی وہ اس  
 کا مالک تھا اور اسے جس طرح چاہے استعمال کرتا۔ اسے کون روک سکتا  
 تھا۔ زبان کے سلسلے میں اسے سب سے زیادہ عبور گائیوں پر تھا۔ میں  
 نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا کہ جو عبد الصمد سے بہتر گالی دے سکتا  
 ہو۔ تیری دل کے دودھ میں حکم کا لگا۔ ایسی گالی کوئی شاعر ہی دے سکتا ہے  
 اور گائیوں کے سلسلے میں عبد الصمد ایک شاعر تھا۔ جن کا ارتقا فصاحت  
 بلاغت کا بادشاہ تھا۔ جب گالی دیتا تو اس کے انداز میں ایک ایسی خطا  
 ہوتی اور زبان و بیان میں وہ روانی ہوتی کہ مجھے ہندوستان کے بہترین

سیاست دان یاد آجاتے جو اکثر باتیں زیادہ کہتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں۔ لیکن عبدالصمد میں یہ ایک خاص بات تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا تھا تو کام بھی بہت اچھا کرتا تھا۔ پریس کے منیجر کو وہ اپنی بدزبانی کی وجہ سے ناپسند تھا۔ لیکن کام اتنا اچھا کرتا تھا کہ وہ اسے پریس سے نکالنا نہ چاہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے اور ممکن ہے آپ نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ کہ جتنے غنڈے ہوتے ہیں۔ کام کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سب سے اچھے مزدور بھی غنڈے ہوتے ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے۔

ہے نا!

عبدالصمد ایک اچھا مزدور تھا۔ اور اگر اس میں بات بنانے۔ گالی بکھنے اور بلاوجہ لوگوں پر ہنسنے کی عادت نہ ہوتی تو وہ ایک اچھا آدمی بھی ہوتا۔ ہاں وہ ہر وقت پان کھاتا تھا جس سے اس کے بڑے بڑے دانت اور بھی کریدہ معلوم ہوتے تھے۔ گالی بکھنے میں اسے وہ کمال حاصل تھا۔ کہ بڑے بڑے ادیبوں کو عمر بھر کی محنت کے بعد بھی وہ طرزِ انشاء نصیب نہیں ہو سکتا اور ہنسی، اس کی ہنسی سب بڑی تھی پٹا دار، گونجدار، بلند و بالا ہنسی جو پریس کی تاریک عمارت اور خاص کر جس کمرے میں وہ

## تین غنڈے

کام کرتا تھا۔ اس کے لیے قطعی طور پر نامزد ہوتی۔ یہ ہنسی یا دولا قی نہی۔  
 پہاڑوں کی جہاں صنوبروں کے جنگل کھڑے ہیں۔ وسیع میدانوں کی  
 جہاں میلوں تک گیہوں کے کھیت کھڑے ہیں، تاروں بھری رات کی  
 جب سب سو جاتے ہیں اور رات کی رانی اس افق سے اُس افق تک لگتی  
 پھیلائے سورج کی کرنوں کا انتظار کرتی ہے۔ یہ ہنسی جو گریا سمندر کا سینہ چیر  
 کے نکلی تھی اور ساری دھرتی پر پھیلی جا رہی تھی۔ انسان کی ہنسی نہیں کسی یو کی  
 ہنسی معلوم ہوتی تھی۔ کرخت، بُری، گندی، ابھری ہوئی، بڑھتی ہوئی یہ پری  
 کی محدود تاریک چار دیواری کے لیے قطعی نامزد ہوتی تھی۔ اس پر بھی عبد الصمد  
 اکثر ہنسا رہتا تھا گالی بکاتا رہتا تھا۔ اور منجر کے سامنے لیٹ کر کے پتھر اٹھائے  
 اکڑتا چلا جاتا تھا۔ غنڈا !

میں نے پہلی بار اسے فائن آرٹ پریس میں دیکھا تو ایک سخت کراہیت  
 اور نفرت کا احساس مجھے دل میں پیدا ہوا۔ جے جے ہسپتال کے رشتہ  
 کے لوگ اُن محفلِ قصہ و سرود منعقد کرنا چاہتے تھے۔ اور میں اس  
 کنسرٹ کا پروگرام شائع کرانے کے لیے پریس میں آیا تھا۔ یہاں میں نے  
 عبد الصمد کو پہلی بار دیکھا۔ آپ بڑے ٹھٹھے سے کمر پکاتے دیکھے فرما رہے

تھے۔ ”وہ لیتھو کا پتھر مجھ سے ٹوٹ گیا۔ مینجر صاحب“  
 ”کیسے ٹوٹ گیا؟“

”یہ کیسے بتاؤں اس بات سے چھوٹ گیا اور دو ٹکڑے ہو گیا۔ دیکھئے  
 اس مادہ چود پتھر کو آج ہی ٹوٹنا تھا۔ دو سال ہو گئے مجھے اس حرامی پریس  
 میں کام کرتے ہوئے۔ دیکھئے کبھی ایسی داروات نہیں ہوتی“ یہ کہہ کر  
 آپ نے سر کھجایا اور سر سے ایک جوں نکال کر اُسے اپنے ناخنوں کی چوٹی  
 میں پیتے ہوئے بولے۔ ”بہت تیری جوں کے منہ میں سوراخ کے کباب!“  
 مینجر لولا: ”سیدھی طرح بات کر دو“

”سیدھی طرح تو کہہ رہا ہوں جناب مہنی جو صاحب۔ لیتھو کا پتھر ہم سے  
 ٹوٹ گیا۔ معافی چاہیے یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ گویا معافی مانگنا اُسے عجیب  
 سا لگ رہا تھا۔ اس کے دانت اور اس کے مسوٹھے بلکہ اس کا حلق  
 اور تالونک مجھے نظر آ رہا تھا میں ذرا پر سے ہٹ گیا۔ کیونکہ اس کے  
 جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی تھی۔ ہر غنڈے کے جسم سے بو آتی ہے  
 زمین کی بو، پسینے کی بو اور پیاز کی بو۔ اور گو اس کا جسم بدبو دار تھا۔ اس کا  
 دل بدبو دار نہیں تھا۔ جس طرح اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ شریر اکھیں گھننے



## تین خٹے

ابروؤں کے نیچے چمکتی تھیں۔ اس میں کوئی بدلہ نہ تھی۔ دس تاریخ کو جب اُسے تنخواہ ملتی اور وہ منیجر صاحب کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتا ایسی نگاہیں جن میں تشکر کے علاوہ حیرت ہوتی اور ایک ایسا جذبہ جیسے وہ نگاہ کہ رہی ہے۔ تو منیجر نہیں ہے تو میرا بھائی ہے یہم دونوں انسان ہیں۔ اس جذبے میں بھی کوئی بدلہ نہ تھی اور اس کی مسکراہٹ، غلیظ مسکراہٹ جس میں پریس کاپینٹ اور مشینوں کا آئیل گھلا ہوا تھا اس میں بھی کوئی بدلہ نہ تھی۔ لیکن اس کا جسم بدلہ دیتا تھا۔ اس کے مسوٹھے غلیظ تھے۔ اس کی باہوں کے مسل پٹوے ٹھٹھے تھے۔ اور وہ گالی بکتا تھا۔ اور ہر وقت لڑائی کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ وہ غنڈا تھا، غنڈا۔ اور جب منیجر نے اسے اس طرح ہنستے ہوئے معافی مانگتے ہوئے دیکھا اور وہ بھی ایک غیر آدمی کے سامنے، تو اس کے دل میں غلیظ و خضب کا اک طوفان اٹھ اٹھا اور اس نے بات میں بکڑی کارول لے کر میز پر زور سے مارا اور عبدالصمد کو بلند آواز میں گالی دے دے کہ وہ کبھی اس کا قصور معاف نہیں کرے گا۔ لیکن تھوکانا پتھر بہت سنگلا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے۔ بوریہ سے آتا ہے جو جمنی میں واقع ہے تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اور آج کل بڑی مشکل ہے

دستیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ جو منی کو اتحادیوں نے شکست دے دی ہے،  
تعبیں معلوم نہیں ہے آج کل پتھر بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔

عبد الصمد نے جواب دیا: ”مجھے سب علوم ہے۔ پتھر تو ہندوستان  
میں ہی آتے ہیں کہ ایک ہادی فوج پتھر مارا کہے ہندوستان سے باہر  
نکالی جاسکتی ہے۔ پتھر تو ملتا ہے منیجر صاحب۔ لیکن روٹی نہیں ملتی گالی  
کے بغیر بے عزتی کے بغیر منیجر صاحب اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ گالی دینے  
میں آپ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہ کہہ کر عبد الصمد نے جو منیجر کی ماں  
کے دودھ میں حکم کا یکہ پھینا شروع کیا تو سارے پریس والے اس کے گرد  
جمع ہو گئے۔ منیجر نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی عبد الصمد نے  
کہا: ”گھر رکھو اپنے پتھر۔ عبد الصمد عبد الصمد ہے۔ اس کا چٹم بشتا نہیں  
ہو سکتا۔ پتھر ٹوٹ گیا تو ہم کیا کریں۔ اپنے چٹم چوڑا کاٹ کے رکھ دیں  
پریس میں، واہ منیجر صاحب اور اوپر سے گالی دیتے ہو۔ ہم کام نہیں  
کریں گے کبھی کام نہیں کریں گے۔ اس سارے پریس میں۔ ہم ابھی چلے  
جاتے ہیں۔ فوراً اسی وقت چلے جاتے ہیں۔“ عبد الصمد دیر تک اسی  
طرح بکنا جھکتا رہا لیکن پریس چھوڑ کے گیا نہیں۔ اس معاملے میں اس کی

سیاست انگریزوں سے ملتی جلتی ہے۔ جو ہمیشہ ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں لیکن کمبخت جلتے نہیں۔ خیر وہ خود نہیں گیا، تو دوسرے روز منجھرنے پر بس کے مالک سے کہہ سُن کے عبدالصمد کو ہال سے نکلوا دیا۔ یہ فساد سے دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں نے اگلے روز عبدالصمد کو دیکھا کہ سڑکوں پر اور بھنڈی بازار کے مختلف راستوں پر اور دوسرے غنڈوں کے ساتھ مل کر شور و واویلا کرتا تھا اور ہڑتال کر رہا تھا ایک جگہ سڑچند بگڑے مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈ ہیں تقریر کر رہے تھے۔ ہمیں اس ہڑتال میں، اس فساد میں، اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہیے۔ یہ سب کانگرس کی شرارت ہے۔ تو اس وقت بھی عبدالصمد اور اس کے ساتھی غنڈوں نے شور مچا کر اس امن پسند لیڈ کی ایکٹ چلنے دی اور ”جے ہند“ اور ”ہندوستانی جہازی ہڑتال زندہ باد“ کے نعرے لگانے کے اسے جلسے سے باہر کر دیا اور پھر میں نے سنا کہ ان لوگوں نے ہڑتال کی اور ٹرامیں اور ٹرام کے ٹیڈ جلا دیے اور ان تمام کاموں میں عبدالصمد بھی شامل تھا۔ لیکن ان باتوں کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ چند ریگر کی میٹنگ کے بعد میں نے عبدالصمد کو جے جے ہسپتال میں دیکھا۔ گولی اس کی پیٹھ میں کمر کے پاس لگی

تھی اور پیٹ پھاڑ کے باہر موگتی تھی۔ مگر کپاس ایک چھوٹا سا سؤل خ تھا۔  
 جہاں کوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ اور دوسری طرف پیٹ میں ایک بہت  
 بڑا زخم تھا جو ہر اردل چھڑوں سے پیدا ہوا تھا۔ یہ کارٹوس ڈم ڈم والی  
 گولی والا کارٹوس نہ تھا جو گذشتہ غد میں استعمال کیا گیا تھا۔ یہ ایک نیا کارٹوس  
 تھا۔ نیا اور خوفناک جو جسم کے اندر جا کے پھیل جاتا ہے۔ اور بینکڑوں چھوٹے  
 چھوٹے زخم پیدا کر سکتا ہے۔ مائے کو تو انسان کو یوں بھی ایک معمولی سے  
 کارٹوس سے مارا جا سکتا ہے۔ لیکن غنڈوں کے لیے اس قسم کا کارٹوس  
 خدا اچھا رہتا ہے۔ ہائے ہاں یہ کارٹوس سور کے شکار کے لیے استعمال  
 ہوتے ہیں خیر غنڈے تو سور سے بدتر ہوتے ہیں۔ اچھا ہوا عبد الصمد مر گیا۔  
 عبد الصمد مر گیا اور اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ عمر چھ بیس سال۔  
 ذات راجپوت۔ مذہب سہمان۔ غیر شادی شدہ آنکھوں کی جھک مردہ،  
 لبوں کی ہنسی مردہ۔ زندگی بخش گالی مردہ۔ ہر چیز کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا  
 اور وہ میرے سامنے ذات پھیلائے، منہ کھولے۔ مردہ پڑا تھا۔ ایک  
 طعنہ، ایک تاریک مستقبل۔ ایک خاموش گالی۔ اور اس کی ماں اپنی  
 چھاتی دھتر ٹکڑی رہی تھی اور میں کر رہی تھی اور ہسپتال کے باہر خیے میں

بیٹھے بیٹھے سپاہیوں کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ میرے بیٹے نے ان ظالموں کا کیا بگاڑا تھا۔ میرا بیٹا کیوں مر گیا۔ کیوں گولی اسے لگی۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو گولی میں بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی اینگلو انڈین لڑکی کو بچانے کے لیے باہر نکلا تھا اور کسی نے اس کی پیٹھ میں گولی ڈی لڑکی بچ گئی۔ لیکن میرا جوانی — ہونہار بیٹا۔ ڈاکٹر! میرا بیٹا اس جہان میں نہیں ہے۔ وہ کیوں مارا گیا ڈاکٹر خدا کے لیے مجھے بتاؤ وہ کیوں مارا گیا۔ اس لیے کہ وہ ایک خنڈہ تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا اور اس کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا اور دوسری لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوسرے خنڈے سے میری ملاقات ایک نئے کے گھر پر ہوئی۔ سینڈھرسٹ روڈ جسے گنڈاس روڈ کہتے ہیں۔ بڑے بڑے نبیوں کا مسکن ہے۔ یہیں پدم سی سیٹھ بھی رہتے ہیں، پدم سی سیٹھ جے جے ہسپتال کے ڈاکٹروں میں بہت مقبول ہیں۔ کیونکہ آپ سب لوہے پر ایک سو میں پچھ سو دیتے ہیں۔ اور سارا معاملہ نہایت خاموشی سے طے کرتے ہیں۔ پدم سی سیٹھ کا پرہیزگار کی طرح بھولا نظر آتا ہے۔ مسکراہٹ لکھی میں چپڑی ہوئی

معلوم ہوتی ہے۔ اور لب و لہجہ میں راشن کے باوجود اتنی شکرگلی ہوئی ہے کہ چور بازو کا شبہ ہوتا ہے۔ ہم سی سیٹھ میرے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ اس لیے کہ مجھے قرض کی اکثر حاجت رہتی ہے۔ اور جو دوست مجھے روپیہ ترس دے میں دوا اسے دوست کم بناتا ہوں اور اور پھر ہم سی سیٹھ کوئی زیادہ سود نہیں لگاتے۔ سو روپے پر صرف ایک سو بیس روپے۔ اور پھر وہ بھی بغیر ضمانت کے۔ اب بتائیے اس سے اچھا سودا ہندوستان سے باہر کہاں ہو سکتا ہے۔ آج بھی جب میں غنڈوں سے بچتا بچتا سینڈھرسٹ روڈ پر ہم سی سیٹھ کے مکان پر پہنچا تو انہوں نے میری بڑی آؤ بگت کی۔ وہ مجھے کبھی نہیں ٹالتے ہمیشہ روپیہ دے دیتے ہیں۔ یہ تو انہیں معلوم ہے کہ میں جے جے ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے اور روپیہ مع سٹوڈا بھی کر دوں گا۔ انہیں میرے عشق کا پورا حال معلوم ہے۔ وہ اس نرس کو بھی جانتے ہیں۔ جو اس قدر خوبصورت اور مہنگی ہے کہ اس کے لیے ایک کنواری لڑکی کو ایک سو بیس روپے سیکڑہ سود دینا پڑتا ہے ہندوستان میں ایک تو عشق بہت مہنگا ہے اور پھر خلافِ قانون

## تین غنڈے

بھی ہے۔ سماج نے اور سیاست اور حکومت نے محبت کو خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے۔ آپ کسی انسان کو قتل کر سکتے ہیں مگر اس سے عشق نہیں کر سکتے اگر آپ کسی لڑکی سے کہنا چاہیں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تو وہ فوراً جواب دیتی ہے۔ کیوں کیا تیرے گھراں بہن نہیں ہے۔ گویا اس ملک میں عشق صرف ماں بہن تک محدود ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آدمی عشق کرنے کی جرأت کرے تو جوتی کھاتا ہے۔ پٹا ہے یا گولی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان محبت کرنے کی نہیں نفرت کرنے کی جگہ ہے۔ یہاں انسان انسان سے محبت نہیں کرتا ہے۔ نفرت کرتا ہے۔ لوگ حکومت سے، حکومت لوگوں سے، ماں باپ بیٹوں سے، بیٹے ماں باپ سے نفرت کرتے ہیں، گھر میں چاڑیاں، کارخانوں میں، دفاتروں میں نفرت کا راج ہے۔ کانگریسی، لیگی، سوشلسٹ ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ انھیں جتنی نفرت ایک دوسرے سے ہے، اتنی اجنبی حکومت سے نہیں جس کے پر سب غلام ہیں، ہندوستان ایک صحرائے نفرت ہے۔ جس میں کہیں کہیں محبت کے ٹھکانے نظر آتے ہیں۔ اور یہ بنگال، نرسیم، دیہاتی لڑائیوں اور ظلم شادوں اور عدم تشدد کے حامیوں نے اُگائے ہیں۔

چاروں طرف نفرت کی ریت ہے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔ شاید اس ملک کی آب و ہوا یہی ہے۔ بچائے پدم سی سیٹھ بھی اسی آب و ہوا میں رہتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک آدمی سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر اس نفرت میں کوئی شامل نہیں ہے تو وہ ان کی چھوٹی بیٹی — شانتا ہے۔ شانتا ایک پتلی دہلی ۹ سال کی گجراتی لڑکی ہے جس کو خدانے ذرا خوبصورتی دی ہے نہ ڈانس، پتلی پتلی ٹانگیں، میلے خراک سے باہر نکلتی ہوئی پتلی پتلی باہیں، سوکھا سوکھا سامنہ جیسے پیاس کھنچ کھنچ ہی نہیں، ہر وقت چلاتی رہتی ہے اور منہ میں مٹھائی ٹھونس رہتی ہے۔ اس قدر بھڑبھڑا مذاق، بد صورت لڑکی ہے کہ معاذ اللہ دیکھ کے متل ہوتی ہے۔ مجھے تو ایک تو بچوں سے یونہی نفرت ہے۔ کعبخت جب دیکھو یوں ہی بلا سچے سمجھے چلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کو سی پکڑ کر بلا رہے ہیں۔ تو کبھی آپ کا کوٹ کھینچ رہے ہیں، کبھی تھرا میٹر پر ہات مار رہے ہیں تو کبھی دیوار پچاندنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی بچی جسے ایک پل قرار نہ ہو جس کی آواز بھی تیز اور کرخت ہو۔ اور جس کے لبوں سے ہر وقت جلیبی کی رال بہتی ہو۔ اور جس کا باپ مجھ سے ایک سو میں لڑے سودیتا ہو، آپ اس لڑکی سے میری محبت اور شفقت کا اندازہ کر سکتے ہیں خیر تو



اس روز جب میں دباں پہنچا ہوں تو شاننا کمرے میں موجود تھی اور ادھر سے  
 ادھر اور اس کمرے سے اس کمرے میں اچھل رہی تھی اور چلا رہی تھی اور جلیبیاں  
 کھا رہی تھی پدم سی سیٹھ نے اسے ڈانٹا اور کہا "دوسرے کمرے میں بیٹھ جا۔  
 دیکھتی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! شریف لٹے ہیں" تو شاننا بسورتی ہوئی  
 اور دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتی ہوئی اور شکایتی نگاہوں سے مجھے گھورتی  
 ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ باپ نے اسے جاتے دیکھ کر پھر کہا "اور دباں  
 دیکھ باہر نہ جانا بیٹا باہر ڈنگل ہے۔ پھر انھوں نے ہی کھولی اور شیم کی طرح  
 ملائم آواز میں بولے "آپ کو کتنے رشے چارمیں ڈاکٹر صاحب! میں نے  
 کہا "آج تو میں اپنی آخری قسط ادا کرنے آیا ہوں۔ فی الحال مجھے روپے نہیں  
 چاہئیں۔ کیونکہ فرس سے میری لڑائی ہو گئی ہے۔ اس لیے میرا عشق  
 ختم سمجھئے" وہ ہنسنے "تو رسید کاٹ دوں" میں نے کہا "ہاں لائیے  
 میں بھی دستخط کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ رسید کاٹ دی گئی اور دستخط ہو گئے اور  
 اشام واپس مل گیا اور پھر میں سگریٹ اور وہ بٹری پینے لگے اور ہنسنے  
 لگیں جہاں بھر کی باتیں۔ روٹی کا بجاؤ مندا ہے اور سونے چاندی کا دھندا  
 ہے اور شاگ کا کھینچ گندا ہے اور گلے میں انگریزوں کا پھندا ہے۔ اور

”ہم تو ڈاکٹر صاحب رام آپ کا بھلا کرے بہت بری طرح پھنسنے ہیں۔  
یہ سٹرنگ بیلنس میں نے کہا۔ جی ہاں یہ سٹرنگ بیلنس ہی تک معاملہ  
رہتا تو غنیمت تھا۔ لیکن سیٹھ صاحب سٹرنگ بیلنس کی انھوں نے  
ایک اور شق نکالی ہے اسے Carotia Artery کہتے ہیں۔“  
”کیراٹڈ آرٹری کیا ہے؟“

”کیراٹڈ آرٹری کے ساتھ اینٹی ٹی بین ہائی پو کالائی جرمینی سائڈل لگا کے  
ساتھ میں اس کو Anti Septic بھی کر دیا ہے۔ سیٹھ صاحب  
”باپ اے“ سیٹھ صاحب چونکے۔ ”تب تو معاملہ بہت ڈیڑھا ہے۔“  
میں نے کہا: ”جی ہاں انگریزی اخبار میں سب آیا ہے، آپ نے  
پڑھا نہیں۔“

سیٹھ صاحب ہلکے ”جی نہیں۔ میں تو جنم بھومی پڑھتا ہوں۔ یہ تو چپا  
ہوا آپ نے بتا دیا۔ ایک تو یہ فساد شروع ہے جہازوں نے ہڑتالی کر رکھی  
ہے۔ خندہ گردی ہو رہی ہے اور ادھر سے یہ اینٹی سپٹک آپ نے  
بتا دیا۔ میں تو صاحب چور بازار میں جتنا روپیہ لگا رکھا ہے اب نکلواتا ہوں۔“  
اتنا کہہ کے سیٹھ صاحب نے کر دٹ بدلی۔ تو نیچے گلی میں کار کو س

غنڈے کی بار بار آواز آئی۔ بولے دیکھا آپ نے ہڑتال کرنے سے یہ ہوتا ہے۔  
یہ غنڈے بد معاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا  
ہے۔ یہ غنڈے بد معاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ کارخانے جلانا  
چاہتے ہیں۔ شہر کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا ہے۔ کلجگ  
دھرم کا بیج نہیں۔ اس دھرتی پر۔

میں نے کہا: آپ بالکل سچ کہتے ہیں؟

اتنے میں پھر گولی چلنے کی آواز آئی اور گلی میں آدھ بھاکی صدا بلند ہوئی  
اور بچوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ہم بھاگے بھاگے کھڑکی کی طرف گئے اور  
نیچے جھانک کر دیکھا تو یکایک سیٹھ نے بیچ مار دی اور پھر دھڑا دھڑ  
سیڑھیاں نیچے اترنے لگے۔ میں ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کوئی خاص بات  
نہ ہوئی تھی۔ ہوا بیتھا کر گلی کے نیچے پولس والوں سے آنکھ مچولی کھیلے تھے  
یہ لوگ چھپ کے گلی کے دوسرے کونے میں چلے جاتے اور وہاں سے  
پولس والوں پر بے ہند کے نعرے کہتے اور ان پر نکر پتھر کے چھوٹے  
چھوٹے ٹکڑے پھینکتے اور جب وہ پولس والے ان کو ڈراتے اور ان  
کا لہا قب کرتے تو نیچے بھاگ کے ہنستے کھیلے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے

گلی کے دوسرے نکر پر جا کھڑے ہوتے اور وہاں بھی اسی طرح پولس والوں سے کھیل کھیلتے۔ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا اور بچے دن بھر اسی طرح مشغول رہتے تھے کوئی دوسرا ملک ہوتا تو ان بچوں کی یہ شرارت کھیل سے تعبیر کی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پولس کا سپاہی کسی شریر بچے کے کان کھینچ دیتا۔ دیکھ بیٹا اسٹڈ سے ایسا مت کیجھ اور معاملہ وہیں ختم ہو جانا۔ لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے اس ملک میں محبت نہیں نفرت کا راج ہے۔ اس لیے پولس والوں نے طعنی کو مدد کے لیے بلا لیا۔ اور سینڈ ہرسٹ روڈ پر آنکھ مچولی کا وہ دلچسپ کھیل شروع ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ بچے جب حسب معمول جھینٹے چلاتے۔ کنکر پھینکتے گلی کے نکر پر پہنچے تو یہاں گولیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اور پھر وہ جب یہاں سے ہٹ کے دوسرے نکر پر پہنچے تو وہاں بھی گولیوں سے ان کی آؤ بھگت کی گئی۔ ٹنکر کی گولیوں سے نہیں۔ کارتوس کی گولیوں سے۔ جب بچے زخمی اور جاں طلب ہو کر وہاں سے بھاگے اور گلی کے تیسرے ناکے کی طرف چلے تو وہاں بھی آنکھ مچولی کھیلنے والے سپاہی بیٹھے تھے۔ دھڑا دھڑ گولیاں چلیں اور پھر اس کے بعد بھگت سناٹا ہو گیا چاروں طرف غائب ہوئی۔ کھیل ختم ہو گیا تھا اب جے ہند کھنے والا کوئی نہ تھا۔ سپاہی چلے گئے پھر

یہ ایک لوگ گلی میں گھس آئے اور اپنے زخمی اور مردہ بچوں کو اٹھانے لگے اور مائیں اور بہنیں، بھائی اور باپ دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ پدم سیٹھ نے اپنی زخمی شانتا کو اٹھالیا اور ہم دونوں مل کے اُسے اوپر کمرے میں لے آئے۔ پدم سی دھاڑیں مار کر رہا تھا۔ شانتا میں نے تجھ سے کہا تھا باہر جانا، باہر نہ جانا، کبھی نہ جانا۔ وہ طوطے کی طرح رٹ رہا تھا اور ہاتھ ملتا جا رہا تھا اور وہ بد صورت گجراتی بچی ہے ہند کتے بھوتے مر رہی تھی اور اس کے منہ سے لہو ابل رہا تھا۔ اس کے منہ سے اس کی بانہوں سے اس کے سینے سے لہو نکل رہا تھا۔ اس کا جسم اپنے لہو کے رنگ میں رنگا گیا۔ سرخ رنگ لال اور حسنی۔ ہاتھ کا سینہ روزہ نو سال کی بچی آج بیاہی جا رہی تھی۔ ننھی معصوم دلہن، اس رنگ لے گیا اس کی بد صورتی غائب کر دی۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا اس کی باہیں گول اور گداز اور چھاتی ماں کے دودھ سے بھاری، لے بن بیاہی دلہن آج تیری مانگ میں شہیدوں کا لہو ہے۔ تیری بڑی بڑی انگلیوں میں اُجڑے وطن کا سہاگ ہے۔ تیرے ترے ہوتے لبوں پر بھجے ہند کا فخر ہے۔ آج تو نے ملک کو اپنی زندگی کی آخری قسط ادا کر دی اور اپنے خون سے رسید لکھ کر دی ہے۔ اے ننھی غنڈہ لڑکی

تیری موت آج ہم سب پر جاری ہے اور میں نہیں جانتا کہ کیا کروں کس طرف دیکھوں۔ کس کو بلاؤں۔ کس کو یاد کروں کیوں کہ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے اور تیرے دھڑکے بڑے آدمیوں نے تجھ سے خدائی کی ہے اور تیرا لواستقام کے لیے پکار رہا ہے۔

گجراتی لڑکی مرگئی۔ ایک دوسکیاں۔ جے ہند کا مہم ہوتا ہوا نغمہ، اور پھر اس کا خون پگھلے ہوئے باقوت کی طرح فرش پر پکھر گیا۔ مجھے فضا کی خاموشی یاد ہے۔ جیسے ساری کائنات رو رہی ہو۔ مجھے وہ نگاہ یاد ہے۔ جیسے ہزاروں برجیاں ایک ساتھ دل میں کبھی جا رہی ہوں۔ گجراتی لڑکی مر گئی اور اس کے ساتھ اس کا بچہ والا شوہر مر گیا اور اس کے خولصورت بچے مر گئے۔ اور زندگی اور اس کی تخلیق اور اس کی ساری کی ساری خوبصورتی مر گئی۔

کیا ہونا چاہیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ نغمہ اور وہ پکارا اور وہ آہنگ جس میں اس بچی کا خون گھلا ہوا کبھی مر نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب کوئی گیت، کوئی چیخ، کوئی قہقہہ یا کسی کے خون سے رُچ جائے تو پھر وہ کبھی نہیں مڑتا۔ وہ گلے میں پھندا بن

کے رہتا ہے۔ دل میں ناسور بن کے چھتا ہے اور رُوحِ حیات کا شاہنشاہی کرکھٹتا ہے اسے غنڈہ کہنا آسان ہے، اسے بھول جانا ممکن نہیں ہے۔

### ۳

تیسرا غنڈہ جو مجھے ملا وہ سکھ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں نہیں اپنی موت کے بعد مجھ سے ملا۔ اس نے ایک شلوار پہن رکھی تھی اور ایک پتلی دھاریدار قمیص اور اس کے چہرے پر گولی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔ اس کا گندی چہرہ خاموش تھا۔ خاموش اور نظریاں اس کی چھٹی بھڑکی وارٹھی میں ریشم کی ملائمت تھی۔ اس کے خندہ خال حسین تھے اور زمین کی طمانیت لیے ہوئے اس کے چہرے سے مجھے جاؤں کے وہ گھاؤں یاد آگئے جس میں دھرتی سونا اگلتی ہے۔ جہاں سونے کی مورتیں اپنی سیاہ غزالی آنکھوں میں وحشی محبت کا خمیرا لیے ہوئے پنگھٹ پر کھڑے ہو کر بڑیسیوں کو پانی پلاتی ہیں۔ جہاں نہر کے کنارے لابی لابی دریا ٹی گھاس ہوتی ہے۔ اور نہر کے پکے گیہوں کے خوشے سرسراتے ہیں اور خوشوں سے اُپر نیلا آسمان مہنتا ہوا آسمان اور اُپر اور بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک بھولا ہوا خواب ایک پراسرار حقیقت: اچانک مسرت، یہ سب کچھ اس نوجوان سکھ کے چہرے

پر نظر آ رہا تھا۔ اس کی قمیص کی جیبیں ایک نامکمل خط تھا۔ یہ خط اس نے شاید صبح لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر وہ اسے مکمل نہ کر سکا کیونکہ صبح ہو گئی اور پھر اس کی زندگی کی شام آ گئی۔ اور اس کی آنکھوں کی بینائی اور اس کے ہونٹوں کی گویائی اور اس کے ہاتھوں کی طاقت اس سے چھین گئی۔ گندہ مر گیا۔ اس کا مجھے افسوس نہ تھا۔ افسوس اس خط کے نامکمل ہونے کا ہے یہ خط گورکھی میں تھا اس کا ترجمہ تو میں نہیں کر سکتا کوئی کسی کی روح کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہے۔ اس لمحے کا۔ اس زبان کا۔ اس طرزِ ادا کا۔ جو شخصیت ہے۔ پھر بھی جیسا بڑا بھلا مجھ سے ہو سکا۔ یہاں درج کرتا ہوں۔

”میری ماں جی۔ ست سری اکال۔ واگور وکی کرپا سے میں یہاں خیریت سے ہوں اور خیریت آپ کی واگور و ہمارا ج کی کرپا سے لکھنا مجھ کو بہت جلدی اپنے کو ابھی کوئی ٹھکانا نہیں ملا ہے اور کوئی کام کاج بھی رہے نہیں۔ شہر بمبئی کے بیچ میں ڈنگا ہے اور ہندو مسلمان ایک ہے واگور وکی کرپا سے فکر نہ کرنا۔ تیرا بیٹا جو روز کری حاصل کرے گا۔ تجھ کو روپے بھیجے گا۔ اپنی اچھری بہن کی شادی کرے گا۔ اور اس باقی چودھو کے بچے بنٹے گا سو دہی دے گا۔ میری ماں جی بدکلامی پر ہم کو مایہ کرنا۔



گلال چند بننے کا نام لیتے ہی تیرے بیٹے کو گتہ اجاتا ہے۔ ادھر ابھی میں  
کرپال سنگھ ڈرائیور کی لاری میں سوتا ہوں اور روز صبح اس کی لاری چھوٹا  
ہوں۔ جگجیت سنگھ کو بولنا کہ وہ بہن بنتو کا بیاہ اس بھین یاوے  
منو ہر سنگھ سے ذکرے نہیں تو اس کی جان مار دوں گا۔ جب مجھ کو نوکری  
ملتی ہے تو ایک دم اُس کے خود بنتو کو بھگا کے لے جاؤں گا۔ میری ماں جی  
وہ تمہاری بہو۔ اچھی بہو بن کے خدمت کرے گی۔ اور۔۔۔۔۔“

اس سے آگے خط کچھ نہیں کہتا۔ ماں جو لوگ اس سکھ نوجوان کی لاش  
کو ہسپتال میں لائے تھے وہ کہتے تھے کہ اس نوجوان نے ہیری کیڈ پر اپنی  
جان دی ہے۔ وہ گرانٹ روڈ والے جلوس کے آگے آگے پگڑی سنبھا  
جٹا والا گیت گارہا تھا اور بے فکری سے آگے بڑھ رہا تھا اور جب اسے  
گولی لگی جب بھی گیت گارہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانگرس اور لیگٹ نوں  
جماعتوں کے جھنڈے تھے۔ دائیں بائیں انھیں لہراتا ہوا وہ آگے  
بڑھتا گیا۔ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور وہ اس خون کی بارش میں  
بڑھتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ اور جب وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گر گیا تو  
اس نے کہا یہ میری قمیص اور شلوار کسی حاجت مند کو دے دینا اور مجھے

سکھ دھرم اوسار جلا دیتا۔ آنا کہہ کے اس نے جان سے دی۔ اور وہ  
 وہیں ٹرام لائن پر مر گیا۔ اور دونوں جھنڈے اس کے خون سے سُرخ  
 ہو گئے۔ لیگ کاسبز جھنڈا اور کانگریس کاسبز سفید و ہمرانی جھنڈا دونوں  
 اس کے خون سے ایسے سُرخ ہو گئے تھے کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ  
 کون جھنڈا کس کا ہے اور وہ جو نہ ہندو تھا نہ مسلمان اس نے اپنا ٹو  
 دے کر دونوں جھنڈوں کو ایک کر دیا تھا۔ وہ جو ایک کسان تھا۔ لہجہ  
 اور آن پڑھ تھا۔ غنڈہ !

میں نے اس کی شلوار اور قمیض اپنے ہسپتال کے ہریجن دھوبی کو  
 دے دی۔ دھوبی نے وہ شلوار پہن رکھی ہے۔ نیلی قمیض اس کی بیوی پہنتا  
 چھا ہنتی ہے۔ اس نے اسے پھر سیا ہے۔ جوڑا ہے۔ دوسرے کپڑے  
 کے ٹکڑے لگائے ہیں اور اب یہ قمیض دھوبی کے گھر کے باہر جنگلے کی  
 سلاخ پر پڑی جھول رہی ہے..... یہ عجیب قمیض ہے جو پنجاب کی آئی ہے  
 جسے کسی کسان بچے کی ماں نے اپنے کانپتے تڑپتے ہاتھوں سے سیا ہے،  
 شاعر اور لوگ بڑے بڑے لوگوں کو بڑے بڑے لیڈروں کو سلام کرتے  
 ہیں۔ میں تجھے سلام کرتا ہوں۔ اے غریب مفلوک الحال قمیض، بھولی بھٹی

## تین غنڈے

بہتری ہوئی گالیاں کھاتی ہوئی قمیص، میں تجھے ہزار بار سلام کہتا ہوں۔ تو نے اک جھوٹے جھاٹ کے مضبوط سینے پر گولی کھائی ہے۔ تو نے اس سے پیار کیا ہے۔ اس کا ساتھ دیا ہے، زندگی میں اور موت میں اور اس وقت جب اس ملک کے بڑے بڑے چاہنے والے اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

تجھ پر ہزاروں سلام۔ اے میرے وطن کی وسیع غریبی کی طرح پستی پرانی قمیص، تو نے اپنی آغوش میں ایک معصوم کاشتکار کے دل کی دھڑکنیں چھپائی ہیں اور اب تو ایک ہتکین ماں کے دودھ کی عزت اور اس کے ننھے بیٹے کی جان کی حفاظت کرے گی۔ سا نہیں بھی اپنی زندگی کی سادہ روئی بخش۔

انہیں بھی اپنی دھرتی کا پیار ہے، اپنی روح کا وہ صادق جذبہ کہ جس سے ہم کنار ہو کے ہم سب بہتری کی طرف بڑھنے لگے ہیں۔ انہی طرح ہو آئیں لہر آ رہ۔ ٹو حسن اور سچائی اور نیکی کی تصویر ہے۔ تو اس آنے والے طوفان کی تنویر ہے۔ جب زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور آدمی محبت کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح یہ تینوں غنڈے مر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ فساد کے دنوں میں ہوا۔ لیکن اب وہ ہنگامہ ختم ہو چکا ہے، اب چاروں طرف سکون ہے۔

امن اماں ہے۔ غنڈے مرچکے ہیں یا گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیے گئے ہیں اور اب شہر میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ہسپتال کے وارڈز خیموں اور لاشوں سے پٹے پٹے ہیں، اب چین ہی چین ہے۔ اب کالی رات ہے خاموشی ہے۔ میں ہسپتال سے تھکا ماندہ آ رہا ہوں اور نہادھو کے کھانا کھا کے لیٹر کے قریب لیپ روشن کیے دیوان پر بیٹھا ہوں اور اخبار پڑھ رہا ہوں۔ اخبار میں لکھا ہے۔ مسٹر اور مسٹر بھنسی اور مسٹر بندری گر اور مسٹر تان اور دوسرے مخموز شہری ایک انگریزی بحری جہاز پر مدعو کئے گئے ہیں جو ساحل پر اس لیے لنگر انداز ہوا ہے۔ تاکہ جہازی ہٹائیوں کی بنیاد کا سدباب کر سکے۔ مسٹر بندری گربرات کے دولہا معلوم ہوتے ہیں۔ مسٹر بھنسی نے ایک ہلکے رنگ کی بنی مینس پہن رکھی تھی جو بھنسی کی ساری کارنگ پگھلے ہوئے یا قوت کی طرح ہے۔ یہاں امن اور قانون اور ترقی اور دستور اور انقلاب کے جام پٹے جا رہے ہیں اور میں اخبار پھینک دیتا ہوں اور پھر ریک سے ایک کتاب نکال کے پڑھتا ہوں۔ انسان کی تاریخ از ایچ جی۔ ویلز اور میری آنکھوں کے سامنے بری کیدنا چنے لگتے ہیں۔ آدمی نے ہزاروں سال پہلے بھی یہ بری کید بندے تھے۔ ظلم اور جہالت اور گناہ کو مخلوب کمنے

## تین خنڈے

کے لیے بیری کیڈ میری نگاہوں کے آگے ناچ رہے ہیں۔ ہرج، محمد مسیح۔  
... پھر روشنی کی مشعل کا زاویہ تبدیل ہو جاتا ہے چارلس اول کا سر نظر آتا ہے  
دار پر لٹکتا ہوا۔ پیرس میں گلو تین... بکیون... اکتوبر میڈرڈ....  
آج بھی بیری کیڈ کھڑے ہو رہے ہیں۔

مرا کو میں..... انجیریا میں..... مصر میں..... ہندوستان میں....  
انڈو چائنا میں.... انڈونیشیا میں..... یہ طوفان ہے طوفان، اسے  
کون روکے گا... یہ انقلاب ہے انقلاب، اسے کون چھیڑے گا۔ یہ قمیص  
ہے قمیص.... آدمی کی قمیص۔ ہوا میں لہراتی ہوئی۔ اسے گولیوں سے  
چھلنی کر دو۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اسے بموں اور ٹینکوں سے  
اڑا دو۔ یہ پھر ثابت و مسلم ہو جائے گی یہ قمیص مر نہیں سکتی۔ یہ آدمی  
کی روح ہے!